وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَہَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَہُوْقًا
اور کہہ دے حق آ گیا اور باطل بھاگ گیا۔ یقیناً باطل بھاگ جانے والا ہی ہے۔ (بنی اسرائیل: ۸۱)
صداقت احمدیت
ادارہ المورد کے اعتراضات کا رد
تالیف: عدیم احمد

Contents

ابتدائیہ 5

باب اول: خواب و مکاشفات اور استقامت و ترقی 7

خواب و مکاشفات 7

استقامت و ترقی 11

پیش گوئیوں پر اعتراضات کے جوابات 15

پیش گوئی محمدی بیگم 16

پیش گوئی عبداللہ آتھم 17

ثناءاللہ امرتسری سے مباہلہ 17

پیش گوئی طاعون 17

مباہلہ 18

فیصلے کے چھ طریق 18

باب دوم: تسلسل نبوت 20

امت محمدیہ میں انبیاء کی خوشخبری 23

آنحضرت ﷺ کی اتباع: نبوت کی بنیادی شرط 25

آئندہ انبیاء پر ایمان لانے کے متعلق امت مسلمہ سے عہد 28

نبوت: اللہ تعالیٰ کی سنتِ جاریہ 31

باب سوم: جھوٹا مدعی الہام اور اس کا انجام 33

قتلِ انبیاء 35

باب چہارم: ایک مصلح کی نوید 37

قرآن و حدیث میں امام مہدی کی پیش گوئی 37

بعض اعتراضات کا رد 39

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا فارسی الاصل ہونا 39
پیش گوئی: آنحضرت ﷺ کا ایک گواہ آئیگا 40
مسیح موعود کے زمانے کی علامات (حصہ اول) 43
مسیح موعود کے زمانے کی علامات (حصہ دوم) 46
متفرق اعتراضات 49
باب پنجم: آیت خاتم النبیین 50
غامدی صاحب کی تفسیر 53
باب ششم: حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خداداد فصاحتِ کلام 55
اختتامیہ 60

صداقت احمدیت - عرفان شہزاد صاحب کے اعتراضات کا جواب

راقم: عدیم احمد

ابتدائیہ

جاوید احمد غامدی صاحب کے ادارے المورد سے منسلک ایک صاحب عرفان شہزاد نے "احمدیت کی اشاعت اور بنیادی استدلالات کا مختصر جائزہ" کے نام سے فیس بُک پر قسط وار ایک مضمون لکھا تھا جو اگست 2018 کے ماہنامہ اشراق میں بھی شائع ہوا تھا۔ ان کی تقریباً تمام اقساط کا جواب خاکسار نے دیا تھا۔ بعد ازاں، اسی مضمون میں کچھ اضافہ کر کے، جو زیادہ تر احمدیہ مخالف لٹریچر سے نقل شدہ اعتراضات تھے، کتاب "ختم نبوت اور احمدی استدلال" کی صورت میں شائع کیا گیا۔ اب اس تحریر میں ان معدودے اضافہ جات کا جواب بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

سب سے پہلے ہم ان کے مضمون کے ابتدائیے پر کچھ تبصرہ کریں گے۔ عرفان شہزاد صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ 'اہل ایمان' نے احمدیوں کے ساتھ جو رویہ رکھا ہے وہ دراصل وہی طرزِ عمل ہے جو منکرین کا انبیاء کی جماعتوں کے ساتھ ہمیشہ سے رہا ہے۔ انھوں نے قرآن مجید سے حوالے دیئے ہیں کہ دلائل کے مقابل تمسخر اڑانا ہمیشہ اہل باطل کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ اسی طرح ڈرا دھمکا کر اپنی ملت میں لوٹانا قوم شعیب کا طریق تھا، سماجی مقاطعہ یعنی بائیکاٹ کفار مکہ کا حربہ تھا، دلیل کے مقابل جلاؤ گھیراؤ مخالفینِ ابراہیم علیہ السلام کا وطیرہ تھا اور عقیدے کی تبدیلی پر سرکاری پابندی لگانا فرعون کا کام تھا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ مسلمان احمدیت کی مخالفت میں ابو جہل، ابولہب اور فرعون جیسے کردار بن گئے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ابو جہل و فرعون ہمیشہ انبیاء کے مقابل ہی پیدا ہوا کرتے ہیں۔ کیا انبیاء کی جماعتوں کے علاوہ بھی کوئی جماعت ہے جس کے مقابل اس درجے کی مخالفت کھڑی ہوئی ہو، پورے پورے ملک سرکاری سطح پر ان کو نابود کرنے کے درپے ہوں اور وہ پھر بھی مسلسل ترقی کی شاہراہ پر ہوں؟ کیا جماعت احمدیہ کی انبیاء کی جماعتوں سے ایسی کامل مشابہت محض اتفاق ہے؟ کیا کسی اور جماعت کو بھی ایسی مشابہت میسر ہے؟ کیا قرآن مجید میں انبیاء سابقہ کے احوال محض قصے کہانیاں ہیں یا ان میں ہمارے لئے آئندہ کا سبق بھی ہے؟ ان سوالوں کے جوابات درست نتائج تک پہنچنے میں بہت معاون ہوں گے۔

ہم قرآن مجید کی روشنی میں کامل ایمان رکھتے ہیں کہ انبیاء اور ان کے مخالفین ہمیشہ ایک ہی ڈگر پر چلتے ہیں۔

علاوہ ازیں عرفان شہزاد صاحب نے علمی دلائل سے قبل دو باتیں فرمائی ہیں اور دونوں ایسی کمزور بنیادوں پر کھڑی ہیں کہ ان کے مطالعہ سے فاضل ناقد کی علمی و استدلالی کمزوری سامنے آجاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ احمدیت سے متاثر سنجیدہ افراد کے ساتھ مکالمہ و مباحثہ کے بعد انھوں نے کچھ نتائج اخذ کئے ہیں جن پر وہ ایسے نقد کرتے ہیں گویا کہ یہ جماعت کا مجموعی موقف ہو۔ کیا چند افراد کی رائے پوری جماعت کی رائے قرار دی جاسکتی ہے؟ آخر کیوں تنقید سے قبل انھوں نے بانی جماعت اور خلفائے سلسلہ کی ان امور پر رائے جاننا ضروری نہ سمجھا؟ خیر، اس بات کو ہم منصف مزاج قاری پر چھوڑتے ہیں۔ ان میں سے ایک "خواب و مکاشفات" کے تحت ہے اور دوسری انھوں نے "استقامت" کے نام سے تحریر فرمائی ہے۔

باب اول: خواب و مکاشفات اور استقامت و ترقی

خواب و مکاشفات

عرفان شہزاد صاحب نے لکھا ہے کہ دیگر صوفی سلسلوں کی طرح احمدیت بھی ایک صوفی سلسلہ ہے۔ اس لئے یہاں بھی خواب و مکاشفات ہی حق و صداقت کا فیصلہ کن معیار سمجھے جاتے ہیں۔ تمام تر دلائل کے بعد گویا یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہمارے اور تمھارے درمیان فیصلہ ہمارے خواب کریں گے۔

سب سے پہلے یہ واضح ہو کہ جماعت احمدیہ کے نزدیک حق و صداقت کا فیصلہ کن معیار قرآن و حدیث ہے جبکہ خواب و مکاشفات اس کے بعد تائیدی و تصدیقی حیثیت رکھتے ہیں (یہاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وحی زیر بحث نہیں کیونکہ نبی کی وحی بہر حال روایات پر مقدم ہے)۔ لیکن نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ چونکہ عرفان شہزاد صاحب کا مطالعہ کتب سلسلہ نہ ہونے کے برابر ہے اس لئے انھوں نے ایک صریحاً غلط بات ہماری طرف منسوب کر دی ہے۔

اب ان کی اس بات کا تجزیہ کرتے ہیں کہ "*احمدیت بھی ایک صوفی سلسلہ ہے۔*"

درحقیقت اہل المورد کے نزدیک اب مذہب صرف علمی و عقلی تفکر کا نام ہے۔ ان کے نزدیک خدا سے تعلق قائم تو ہو سکتا ہے لیکن پہلی امتوں جیسا نہیں بلکہ تقریباً یک طرفہ یعنی آپ نمازیں پڑھیں دعائیں کریں لیکن اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ خدا کی طرف سے کوئی رابطہ یا روحانی تجربہ یعنی الہام وغیرہ ممکن نہیں۔ گویا ان کے نزدیک اسلام کسی فلسفے کا نام ہے جس کی گتھیاں سلجھانا ہی اب مقصود حقیقی ہے۔ جو شخص اس سے بڑھ کر بات کرے یعنی خواب و مکاشفات کو بھی مذہب کا لازمہ قرار دے، جیسا کہ ہمیشہ رہا ہے، وہ ان کے نزدیک صوفی ہے یعنی اس کا اسلام سے تعلق نہیں۔ یہ بنیادی غلط فہمی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ ہم انھیں قرآن مجید و احادیث مبارکہ کی طرف بلاتے ہیں کہ وہ مذہب کی تاریخ پر نظر دوڑائیں۔ غیر انبیاء کے الہامات جو قرآن مجید میں نقل ہوئے ہیں ان پر غور کریں۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ، حضرت مریم اور حوارینِ عیسیٰ کے الہامات۔

اسی طرح اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کو بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے کثرت سے خواب اور مکاشفات ہوتے تھے۔ احادیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ روزانہ نماز فجر کے بعد صحابہ سے دریافت فرمایا کرتے تھے کہ کیا کسی نے کل رات کوئی خواب دیکھا؟ اور پھر آپ ﷺ اس کی تعبیر بیان فرما دیتے۔ (مسلم: 5937)

نیز آنحضرت ﷺ نے بشارت دی ہے کہ اس امت میں بھی محدَّث یعنی صاحبِ الہام پیدا ہوں گے فرمایا پہلی امتوں میں محدَّث ہوتے تھے، میری امت میں ان میں سے ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔(مسلم:6204)

اسی طرح حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے الہامات بھی مشہور و معروف ہیں۔(دیکھیں دلائل النبوۃ، جامع الاحادیث، کنز العمال، خصائص الکبریٰ)

چنانچہ جہاں ایک طرف علمی و عقلی دلائل اور تفقہ فی الدین کی اہمیت مسلم ہے وہیں دوسری طرف خواب و مکاشفات کے انعام سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مذہب کے ہمیشہ دو ہی مقاصد رہے ہیں ایک، اللہ تعالیٰ سے زندہ تعلق اور دوسرا، اس کی مخلوق سے تعلق باقی سب اس طرف لانے کے ذرائع ہیں۔

اس لئے جماعت احمدیہ بفضل تعالیٰ اصحاب رسول کے منہج پر ہے۔

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ یہ خواب و مکاشفات ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں جو دوسروں کیلئے حجت نہیں ہو سکتے۔ نیز ایسے خواب جب بھی دنیا سے متعلق ہوئے ہیں یعنی ان کے ذریعے پیش گوئیاں کی گئی ہیں، تو ان کی حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے۔

سب سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جب احمدی خواب اور مکاشفات کو بطور دلیلِ حق دوسروں کے سامنے رکھتے ہیں تو ان کے پیش نظر وہ خواب اور مکاشفات ہوتے ہیں جو دنیا سے متعلق ہیں، یعنی پیشین گوئیوں کا رنگ رکھتے ہیں اور جنہیں پرکھا جا سکتا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ہماری سچائی کی دلیل جو غیروں کے مقابل ہم پیش کرتے ہیں، ایسے خواب ہیں جو پرکھے جا سکتے ہیں نہ ذاتی نوعیت کے۔

پھر عرفان شہزاد صاحب نے لکھا ہے کہ بلا امتیاز مسلک و مذہب کچھ روحانی طاقتوں کا حصول ممکن ہے جس سے کسی حد تک درست پیش گوئیاں بھی کی جا سکتی ہیں۔ اور پیش گوئی کرنے کی صلاحیت بھی بہت سوں میں کسی حد تک ہوتی ہے اور بعض میں غیر معمولی بھی ہو سکتی ہے اور اسے کچھ روحانی مشقوں سے بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔ لہٰذا تمام صوفیاء اور مرزا صاحب کے الہامات اور پیش گوئیاں خدا کی طرف سے نہیں تھیں بلکہ سب اسی خود فریبی کا شکار رہے۔

پہلی بات یہ کہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے مکاشفات وغیرہ کی خواہش رکھنے کی بجائے اعمال صالحہ پر توجہ دینے کی نصیحت فرمائی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ ہماری روحانی مشقیں نماز و روزہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لہٰذا اگر روحانی مشقوں سے آپ کی مراد نماز روزہ ہی ہے تو تمام انبیاء بھی آپ کی تنقید کی زد میں ہیں اور اگر اس کے علاوہ کچھ اور مشقیں ہیں تو جماعت احمدیہ میں ان کا ثبوت آپ کے ذمے ہوا۔

گو یہ درست ہے کہ انبیاء وغیر انبیاء کی وحی یکساں نہیں لیکن یقینی اور غیر مبہم الہامات غیر انبیاء کو بھی ہوتے ہیں۔ایک عورت آسمان سے آواز سنتی ہے اور اپنے شیر خوار بچے کو دریا کی بے رحم موجوں کے سپرد کر دیتی ہے۔یہ تھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور یہ ہے غیر انبیاء کی وحی کا معیار۔

فاضل ناقد کی یہ تنقید ایک ایسے شخص کی تنقید ہے جو اس میدان میں تجربات نہیں رکھتا ہے۔اور مختلف اقسام الہام میں تمیز نہیں کر سکتا سو اس کی سب باتیں اٹکل اور اندازے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔نہ یہ کوئی علمی بنیاد رکھتے ہیں اور نہ تجرباتی۔ہم یہاں ایک ایسے شخص کا جواب پیش کرتے ہیں جو الٰہی مکالمہ و مخاطبہ سے مشرف ہے اور خدا کا مسیح و مہدی ہے۔"حقیقۃ الوحی" سے ان شبہات کا ازالہ پیش خدمت ہے۔

اس تصنیف کا مقصد بیان فرماتے ہوئے آپ علیہ السلام لکھتے ہیں، لوگ ان شبہات میں ہیں کہ کیسے علم ہو کوئی خواب یا الہام خدا کی طرف سے ہے اور شیطان یا نفس سے نہیں۔جبکہ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو بلا امتیاز مسلک و مذہب کچھ سچے خواب آجاتے ہیں۔اور اس میں ان کے تقویٰ یا تزکیہ کو بھی کچھ دخل نہیں ہوتا۔آپ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ گو یہ درست ہے کہ سچے خواب بھی شیطانی ہو سکتے ہیں لیکن وہ لوگ جو خدا سے صدق و وفا اور عشق کا تعلق رکھتے ہیں، شیطان ان پر تسلط نہیں پا سکتا۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو فرمایا ہے کہ "میرے بندوں پر تیرا کچھ تسلط نہ ہوگا۔"(الحجر:42) اس کے بعد آپ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ وہ لوگ جو ابھی شیطانی قبضے میں ہیں اپنے الہام بیان کرتے ہیں تاکہ انھیں اپنے مذہب کی سچائی کے ثبوت کے طور پر پیش کریں۔اور ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے خواب بیان کرتے ہیں اور مقصد یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ ایسے تجارب حق و باطل کا معیار نہیں۔

اور اس سے بھی پہلے اپنی کتاب کے دیباچے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے واضح فرمایا ہے کہ خدا کو اپنی قوت سے شناخت نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ خود اپنے تئیں شناخت نہ کروائے۔

بعد ازاں آپ علیہ السلام نے ملہمین کی تین اقسام بیان فرمائی ہیں:

(1) وہ لوگ جنھیں بعض سچے خواب آجاتے ہیں یا بعض سچے الہام ہو جاتے ہیں لیکن انھیں خدا سے کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا۔اس میں مسلک و مذہب کی کچھ تمیز نہیں۔

(2) وہ لوگ جنھیں بعض سچے خواب آتے ہیں یا سچے الہام ہو جاتے ہیں اور انھیں خدا سے کچھ تعلق بھی ہے لیکن کچھ بڑا تعلق نہیں۔

(3) وہ لوگ جو خدا تعالیٰ سے اکمل و اصفیٰ طور پر وحی پاتے ہیں، جنھیں کثرت سے سچے خواب آتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے اکمل و اتم طور پر محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔یہ مقام ہمارے سید و مولا حضرت محمد ﷺ کی کامل اتباع کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک بنیادی اور اہم نکتہ بیان فرمایا ہے۔ آپؑ لکھتے ہیں کہ انسان چونکہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ اپنے خالق کو شناخت کرے اور اس کی ذات و صفات پر ایمان لانے کیلئے کامل یقین پیدا کرے اسی لئے جیسے اللہ تعالیٰ نے انسان کو معقولی قوتیں عطا فرمائی ہیں اسی طرح روحانی قویٰ بھی اس میں رکھے ہیں۔ چنانچہ مصنوعات باری تعالیٰ اور ان میں موجود حکمت کاملہ کی شناخت کرکے، عقل اس حد تک رہنمائی کرتی ہے کہ اس کائنات کا ایک صانع ہونا چاہئے۔ لیکن کیا وہ درحقیقت موجود ہے، اس کیلئے روحانی قویٰ رکھے گئے ہیں تا مومن کو خدا کی کامل معرفت حاصل ہو۔ لیکن چونکہ انسانی طبیعت میں اخلاقی رذائل کا حجاب پایا جاتا ہے اور وہ عمداً حقوق اللہ و حقوق العباد میں سستی برتتا ہے اس لئے اس کی فطرت اس لائق نہیں کہ قابل قدر مکالمہ و مخاطبہ اسے نصیب ہو۔ لیکن خدا کی عنایت ازلی انسانی فطرت کو ضائع کرنا نہیں چاہتی اس لئے اکثر انسانوں کو کبھی سچے خواب و مکاشفات ہوجاتے ہیں اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ انھیں معلوم ہو کہ ان کیلئے قدم آگے رکھنے کی راہ کھلی ہے اور روحانی ترقی کیلئے ان کے ہاتھ میں ایک نمونہ ہو۔ نیز تاکہ وہ نبوت کی حقیقت سے بکُلی ناآشنا نہ رہیں اور پاک نبیوں پر ایمان لانے کیلئے ان پر ایک حجت بھی ہو۔ یہ پہلی قسم کے لوگوں کا حال تھا۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن میں کسی حد تک زہد و عفت اور استعداد رؤیا کیلئے پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ایک سطحی راستبازی ان میں ہوتی ہے۔ "اس درجہ کا آدمی اگرچہ بہ نسبت درجہ اوّل کے اپنی خوابوں اور الہامات میں شیطانی دخل اور حدیث النفس سے کسی قدر محفوظ ہوتا ہے لیکن چونکہ اُس کی فطرت میں ابھی شیطان کا حصہ باقی ہے اِس لئے شیطانی القاء سے بچ نہیں سکتا۔ اور چونکہ نفس کے جذبات بھی دامنگیر ہیں اس لئے حدیث النفس سے بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ وحی اور الہام کا کمالِ صفائی، صفائی نفس پر موقوف ہے۔ جن کے نفس میں ابھی کچھ گند باقی ہے اُن کی وحی اور الہام میں بھی گند باقی ہے۔"

تیسری قسم: "جاننا چاہئے کہ خدا تعالیٰ نہایت کریم و رحیم ہے جو شخص اُس کی طرف صدق اور صفا سے رجوع کرتا ہے۔ وہ اُس سے بڑھ کر اپنا صدق و صفا اُس سے ظاہر کرتا ہے۔۔۔ خدا تعالیٰ میں بڑے بڑے محبت اور وفاداری اور فیض اور احسان اور کرشمۂ خدائی دکھلانے کے اخلاق ہیں مگر وہی اُن کو پورے طور پر مشاہدہ کرتا ہے جو پورے طور پر اُس کی محبت میں محو ہو جاتا ہے۔"

اس درجے کے ملہم دیگر لوگوں کی نسبت نمایاں فرق رکھتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک امتیازات یہاں درج کئے جاتے ہیں:

(1) اس مقام پر ملہم کو ایسا پُر شوکت کلام عطا ہوتا ہے جس میں وسیع، عالمگیر اور یقینی پیشین گوئیاں پائی جاتی ہیں جو باعتبار کمیت و کیفیت بے نظیر ہوتی ہیں۔ ان کا پورا نہ ہونا ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔

(2) استجابت دعا بھی ان کا ایک بڑا نشان ہے۔ نہ عام باتوں میں بلکہ عظیم الشان امور میں کثرت سے ان کی دعا قبول کی جاتی ہے لیکن کبھی خدا دعا رد کرکے اپنی مشیت بھی ان سے منواتا ہے تا ان کی عبودیت ظاہر ہو۔

(3)غیر معمولی طور پر خدائی تائیدات ان کے شامل حال ہوتی ہیں اور وہ ہر ایک مخالف پر غالب آتے ہیں۔

(4)کلام خدا کے معارف صحیحہ ان پر کھولے جاتے ہیں۔

"اور پھر اس جگہ ایک اور نکتہ قابل یادداشت ہے اور وہ یہ کہ تیسری قسم کے لوگ بھی جن کا خدا تعالیٰ سے کامل تعلق ہوتا ہے اور کامل اور مصفّا الہام پاتے ہیں قبول فیوض الٰہیہ میں برابر نہیں ہوتے اور ان سب کا دائرۂ استعداد فطرت باہم برابر نہیں ہوتا بلکہ کسی کا دائرہ استعداد فطرت کم درجہ پر وسعت رکھتا ہے اور کسی کا زیادہ وسیع ہوتا ہے۔"

نوٹ: واوین میں "حقیقۃالوحی" سے اقتباسات ہیں۔

استقامت و ترقی

عرفان شہزاد صاحب لکھتے ہیں کہ خواب و مکاشفات کے بعد احمدی اپنی صداقت کی دوسری شہادت یہ پیش کرتے ہیں کہ مخالفت و جارحیت کے باوجود ان کی استقامت اور تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ بات ہمیشہ برحق ہونے کا نشان نہیں ہوتی بلکہ حق و صداقت کا معیار صرف علمی و عقلی دلائل ہیں۔ کیونکہ یہ ایک نفسیاتی ردعمل ہے کہ جب بھی کسی اقلیتی گروہ پر ظلم کیا جاتا ہے تو ان میں مزاحمت اور استقامت پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی گروہی عصبیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کیلئے انھوں نے یہودیوں کی مثال بھی دی ہے کہ جب تک وہ مصر میں فرعون کے ظلم کا شکار رہے، پکے موحد اور متحد رہے۔ جیسے ہی آسودگی نصیب ہوئی، ان میں شرک اور اختلافات در آئے۔ اس لئے جماعت احمدیہ کی پوری دنیا میں اشاعت، روز بروز بڑھتی تعداد اور شدید مخالفت کے باوجود استقامت اس کی صداقت کا معیار نہیں ہو سکتی۔

اول، اگرچہ خواب و مکاشفات اور استقامت و ترقی بھی ہماری صداقت کے شواہد ہیں لیکن فاضل ناقد کی بیان کردہ ترتیب سراسر غلط ہے۔ دوم، ہمیں اس حصر سے بھی اختلاف ہے کہ صرف علمی و عقلی دلائل ہی صداقت کا معیار ہیں کیونکہ جماعت احمدیہ کا دعوی الٰہی جماعت ہونے کا ہے۔ اس لئے قرآن مجید میں الٰہی جماعتوں کیلئے بیان کردہ معیارِ حق و صداقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ گو یہ درست ہے کہ ظلم اور اس کے نتیجے میں استقامت اور ترقی ہمیشہ ہی ہر ایک جماعت کیلئے برحق ہونے کی نشانی نہیں ہوتی لیکن قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے معاملے میں یہ بھی ایک اہم علامت حق شناسی کی ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ نبی کی جماعت کی استقامت و ترقی اول تو ہر ایک مظلوم جماعت جیسی نہیں ہوتی بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہوتی ہے اور دوم، اس کی استقامت و ترقی کے پیچھے خدائے تعالیٰ کی پیشین گوئیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ (المجادلة : 21)

"اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ ضرور میں اور میرے رسول غالب آئیں گے۔"

اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو مصائب اور کمزوری کے وقت تائید و غلبے کی خوشخبری دیتا ہے۔ چنانچہ ہمارے سید و مولا حضرت محمد ﷺ کو اس وقت تائید و نصرت اور غلبے کی بشارات سنائی گئیں جب اس چھوٹی سی جماعت کا وجود ہی خطرے میں تھا۔ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس قلیل جماعت کی استقامت، ترقی اور قیصر و کسریٰ جیسی عظیم سلطنتوں پر غلبہ، قرآن و حدیث میں مذکور پیشین گوئیوں کی بنا پر آنحضرت ﷺ کی صداقت کا معیار نہیں؟ یقیناً ہے۔ پس یہی سنت اللہ ہے جو آنحضرت ﷺ کے غلام صادق حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام کے ساتھ بھی دہرائی گئی۔ اس سے پہلے کہ ہم پیشین گوئیاں نقل کریں، یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مثیل مسیح ہونے کا دعویٰ کتاب فتح اسلام میں فرمایا جو 1890 کے آخر میں لکھی گئی اور 1891 کے اوائل میں چھپی۔ تب بالکل چھوٹی سی جماعت آپ کی بیعت میں تھی۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کی بے شمار پیشین گوئیاں ہیں۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ چند ایک نقل کریں گے۔

سنہ 1883 یہ وہ دور تھا جب آپ کی بیعت میں ایک بھی شخص نہ تھا۔ اس دور میں انگریزی زبان میں الہام ہوا: (واضح رہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام انگریزی زبان سے بالکل نابلد تھے)

"آئی شَیل گِوْیُوْءِ لارج پارٹی اَوف اِسلام"

"I shall give you a large party of Islam"

ترجمہ: میں تمہیں ایک بڑا گروہ اسلام کا دوں گا۔

پھر بعد اس کے یہ الہام ہے:

" ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ "

پہلوں میں سے بھی ایک گروہ ہے اور پچھلوں میں سے بھی ایک گروہ ہے۔ (یعنی پہلے انبیاء کی امتوں میں سے بھی ایک گروہ کثیر تم پر ایمان لائے گا اور مسلمانوں میں سے بھی ایک بڑی جماعت تم پر ایمان لائے گی۔)

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ 556،557 حاشیہ در حاشیہ نمبر 4 روحانی خزائن جلد نمبر 1 صفحہ 664،665)

(تذکرہ صفحہ 81-80)

سنہ 1886 میں یہ الہام ہوا، اس دور میں بھی آپ کی بیعت میں کوئی شخص نہ تھا:

"میں تیرے خالص اور دلی محبوں کا گروہ بھی بڑھاؤں گا اور ان کے نفوس و اموال میں برکت دُوں گا اور اُن میں کثرت بخشونگا۔"

(از اشتہار 20 فروری 1886ء۔ تبلیغِ رسالت جلد اوّل صفحہ 62،60۔ مجموعہ اشتہارات جلد اوّل صفحہ 102، 103)

(تذکرہ صفحہ 112)

سنہ 1889 میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیعت لینے کا اذن عطا ہوا۔ 23 مارچ 1889 کو آپ علیہ السلام نے 40 افراد سے پہلی بیعت لی۔ اس سے 19 دن پہلے 4 مارچ کو آپ نے ایک اشتہار شائع فرمایا جس میں یہ عظیم الشان پیش گوئی درج فرمائی:

"وہ جیسا کہ اس نے اپنی پاک پیشینگوئیوں میں وعدہ فرمایا ہے اس گروہ کو بہت بڑھائے گا۔ اور ہزار ہا صادقین کو اس میں داخل کرے گا۔ وہ خود اس کی آبپاشی کرے گا اور اس کو نشو و نما دے گا یہاں تک کہ ان کی کثرت اور برکت نظروں میں عجیب ہو جائے گی۔ اور وہ اس چراغ کی طرح جو اونچی جگہ رکھا جاتا ہے دنیا کی چاروں طرف اپنی روشنی کو پھیلائیں گے اور اسلامی برکات کیلئے بطور نمونہ کے ٹھہریں گے۔"

(مجموعہ اشتہارات، جلد نمبر 1، صفحہ 193)

سنہ 1897 کے الہامات میں سے یہ دو الہام ملاحظہ فرمائیں:

(1) گو یہ الہام 1897 کا چھپا ہوا ہے لیکن حضور علیہ السلام نے اس پر تحریر فرمایا ہے کہ:

ایک عرصہ ہوا کہ مجھے الہام ہُوا تھا:

" وَسِّعْ مَکَانَکَ یَأْتُوْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ "

یعنی اپنے مکان کو وسیع کر کہ لوگ دُور دُور کی زمین سے تیرے پاس آئیں گے۔

(اشتہار مورخہ 17 فروری 1897ء۔ مجموعہ اشتہارات جلد 2 صفحہ 327)

(تذکرہ صفحہ 246)

(2) " عالمِ کشف میں میں نے دیکھا کہ زمین نے مجھ سے گفتگو کی اور کہا:۔

يَاوَلِيَّ اللّٰهِ كُنْتُ لَآ اَعْرِفُکَ

یعنی اے خدا کے ولی! میں تجھ کو پہچانتی نہ تھی۔"

(سراج منیر صفحہ 78۔روحانی خزائن جلد 12 صفحہ 80)

(تذکرہ صفحہ 249)

سنہ 1898 میں یہ الہام ہُوا:

"میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہونچاؤں گا۔"

(الحکم جلد 2 نمبر 6،5 مؤرخہ 27مارچ و 2اپریل 1898ء صفحہ 13)

(الحکم جلد 2 نمبر 25،24 مؤرخہ 27،20اگست 1898ء صفحہ 14)

(تذکرہ صفحہ 260)

سنہ 1902 میں یہ عظیم الشان پیش گوئی فرمائی:

"دیکھو وہ زمانہ چلا آتا ہے بلکہ قریب ہے کہ خدا اِس سلسلہ کی دُنیا میں بڑی قبولیت پھیلائے گا اور یہ سِلسلہ مشرق اور مغرب اور شمال اور جنوب میں پھیلے گا اور دنیا میں اسلام سے مراد یہی سلسلہ ہوگا۔ یہ باتیں انسان کی باتیں نہیں یہ اُس خدا کی وحی ہے جس کے آگے کوئی بات اَنہونی نہیں۔"

(روحانی خزائن جلد 17، تحفہ گولڑویہ صفحہ 182)

یہ سب الہامات ابتدائی دور کے ہیں اور بہت سے جیسا کہ ذکر کیا گیا ایسے وقت کے ہیں جب ایک بھی شخص آپ پر ایمان نہیں لایا تھا اور قادیان میں بھی بہت سے آپ کو نہیں جانتے تھے اور پھر یہ الہامات اسی وقت شائع بھی کر دیئے گئے تھے۔ باقی الہامات بھی ابتدائی دور کے ہیں جب ایک قلیل جماعت آپ کے ساتھ تھی جسے لوگوں تضحیک اور تمسخر کا نشانہ بناتے تھے۔ پس ایسے وقت میں یہ عظیم الشان پیشین گوئیاں کیا معمولی بات ہے؟ کیا یہ انسان کا

کام ہے ؟یقیناً نہیں۔ سو جیسے پہلے انبیاء اور ان کی جماعتوں کی استقامت اور ترقی، الہی پیشین گوئیوں کی بنا پر ان کی صداقت کا معیار رہی ہے ویسے ہی جماعت احمدیہ کیلئے بھی یہ معیارِ صداقت ہے۔

پیش گوئیوں پر اعتراضات کے جوابات

جب ناقد صاحب اس قرآنی مقدمے کا کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دے پائے تو انھوں نے اینٹی احمدیہ لٹریچر میں جائے پناہ ڈھونڈتے ہوئے ہر قسم کا رطب و یابس بلا تحقیق نقل کیا ہے۔ جس سے ان کی ساری علمیت اور تمام تر تحقیق کی قلعی کھل جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیش گوئیوں پر وہی معروف اعتراضات کئے ہیں جو معاندین احمدیت کرتے ہیں اور جن کا جواب جماعت کی طرف سے ایک عرصے سے دیا جا چکا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ پیشگوئیاں ایسی قطعیت سے خالی ہیں جس سے مخالفین پر کوئی حجت قائم ہو سکے۔ ایک اعتراض یہ ہے کہ پیشگوئیاں مشروط کیوں ہیں اور دوسرا یہ کہ میعاد اتنی زیادہ مقرر کی گئی ہے کہ ان کا وقوع اتفاق قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں حضرت اقدس علیہ السلام کی پیشگوئیوں سے اطلاع ہی نہیں سوائے ان دو چار وعیدی پیش گوئیوں کے جن میں مخالفین کے رجوع سے ان پر سے عذاب ٹل گیا تھا۔

انبیاء علیہم السلام کی پیش گوئیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وعدہ پر مشتمل اور دوسری وعید یا انذار پر مشتمل۔ اللہ تعالیٰ ان پیشگوئیوں سے منکرین کو ایمان اور مومنین کو استقامت کی طرف لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی وعید یعنی عذاب کی پیشگوئی نازل ہوتی ہے تو ہمیشہ اسے توبہ سے مشروط کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ذکر ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم پر عذاب ان کی توبہ کی وجہ سے ٹل گیا۔

"سو ایسا کیوں نہ ہوا کہ قوم یونس کے سوا کوئی اور بستی بھی ایمان لاتی، پھر اُس کا ایمان اُسے نفع دیتا؟ جب اُس بستی کے لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب اُن سے ٹال دیا تھا اور ایک مدت کے لیے اُن کو رہنے بسنے کا موقع دیا تھا۔" (یونس:98) –ترجمہ البیان، جاوید احمد غامدی

یہی امر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وعیدی پیشگوئیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے عرفان صاحب اس عام فہم قرآنی اصول کو نہیں سمجھے اسی لئے وہ اس میں موجود توبہ کی شرط کو قابل اعتراض سمجھتے ہیں۔

چونکہ ناقد صاحب نے احمدی مخالف لٹریچر کو معتبر سمجھ کر ان کے اعتراضات نقل کئے ہیں، ہم واضح کریں گے کہ انھوں نے کس قدر غلطی کھائی ہے اور اس حوالے سے کس قدر صریح جھوٹ انھوں نے نقل کیا ہے جیسا کہ ہم نے ان کے استاذ غامدی صاحب کے متعلق واضح کیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے اپنی کتاب کو نیا مطالعہ قرار دیا ہے لیکن اعتراضات وہی پرانے نقل کر دئے ہیں۔

پیش گوئی محمدی بیگم

مطالعہ و تحقیق کی کمی کے سبب وہ محمدی بیگم سے متعلق پیش گوئی کی تفصیل سے واقف ہی نہیں ہیں۔ یہ پیش گوئی ایک بڑی خدائی وعید کا ایک چھوٹا سا جزو ہے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کے بڑے نشانوں میں سے ایک ہے۔ دراصل محمدی بیگم کے والد مرزا احمد بیگ اور ان کے دیگر رشتہ دار ملحد ہو گئے تھے اور قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کے متعلق عوامی سطح پر نہایت غلیظ زبان استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے اسی نوعیت کا ایک خط حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو لکھا جس میں حضور علیہ السلام کی صداقت اور خدا کے وجود پر نشانات طلب کئے نیز اسے شائع بھی کروایا۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے خدا کی جناب میں دعا فرمائی جس کے نتیجے میں یہ وعید نازل ہوئی کہ اگر یہ لوگ توبہ نہ کریں گے تو ہلاک ہوں گے۔ اسی اثنا میں مرزا احمد بیگ صاحب نے اپنی ہمشیرہ کی زمین اپنے بیٹے کے نام ہبہ کروانی چاہی لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے رشتہ دار ہونے کی وجہ سے یہ حضور کے دستخط کے بغیر ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس نے چاپلوسی دکھائی، حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قریب تھا کہ میں دستخط کر دیتا جب مجھے الہام ہوا کہ اسے کہو پہلے دامادی تعلق قائم کرے۔ اب ظاہر ہے کہ اس تعلق کا مقصد ان لوگوں کو خدا کی طرف لانا تھا جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے اسوہ میں بھی رشتہ ازدواج کا یہ مقصد پایا جاتا ہے۔ اور ایسا نہ کرنے پر احمد بیگ اور اس کے قریبیوں کے متعلق وعیدیں کی گئیں۔ احمد بیگ کے متعلق وعید یہ تھی کہ کسی اور جگہ نکاح کرنے پر وہ تین سال کے اندر اندر ہلاک ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ نکاح کے چھ ماہ بعد ہلاک ہو گیا۔ اس سے اور اس نوعیت کی دیگر پیشگوئیوں سے ظاہر ہے کہ ناقد صاحب کی یہ بات کہ اتنی لمبی مدت طے کی جاتی تھی کہ اس کا وقوع اتفاقی ہو سکتا تھا کس قدر بے بنیاد و خلاف واقع ہے۔

غرض جب یہ وعیدیں پوری ہونے لگیں تو خاندان کے بیشتر افراد ڈر گئے اور رجوع کرنے لگے اور جو قائم رہے وہ ہلاک ہوتے رہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے الحاد و مخالفت سے توبہ کر لی اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مصدق ہو گئے بعض مبایع ہو کر اور بعض اس کے بغیر۔ بیعت کرنے والوں میں چند نمایاں افراد خود محمدی بیگم کی والدہ، بیٹا، بھائی اور بہنیں ہیں۔ جبکہ بیعت کے بغیر مصدقین میں نمایاں نام محمدی بیگم کے شوہر کا ہے جو ثناء اللہ امرتسری کے بار بار اصرار کے باوجود کہ وہ اشتہار دیں کہ پیش گوئی پوری نہیں ہوئی، ہرگز ایسا نہ کیا بلکہ اس کی بجائے تصدیقی انٹرویو دیا۔

اب ہر متقی شخص دیکھ سکتا ہے کہ یہ پیش گوئی کس صفائی سے پوری ہوئی۔ کہاں تو ان لوگوں کی وہ باغیانہ حالت تھی اور کہاں یہ معتقدانہ حال۔

اس پیشگوئی کے حوالے سے عرفان صاحب نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب کو اپنی تمام عمر قطعی طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ یہ نکاح اب نہیں ہو گا جو کہ صریح جھوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کتاب انجامِ آتھم کے صفحہ 32 پر نکاح کی پیشگوئی کو مرزا سلطان محمد شوہر محمدی بیگم کی طرف سے آئندہ اس پیشگوئی کی تکذیب سے معلق قرار دیا تھا کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا تو پیشگوئی میں لوگوں کے لئے اشتباہ پیدا ہو جاتا۔

پیش گوئی عبداللہ آتھم

ایسا ہی حال عبداللہ آتھم کے متعلق وعید کا ہے۔ جس نے اپنی کتاب اندرونہ بائبل میں آنحضرت ﷺ کو نعوذ باللہ دجال کہہ کر پکارا تھا جس پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ پیش گوئی فرمائی کہ اگر اس سے توبہ نہیں کرے گا تو اس میعاد میں ہلاک ہوگا۔ چنانچہ اس نے اسی مجلس میں رجوع کر لیا کہ میں نے آنجناب کے متعلق ایسا لفظ استعمال نہیں کیا۔اس کی توبہ کا مزید ثبوت یہ ہے کہ کہاں تو وہ ایک سرگرم مسیحی مبلغ و مناظر تھا اور کہاں اچانک اس پیش گوئی کے معاًبعد سے اپنی موت تک امرتسر چھوڑ کر ایک گمنامی کی زندگی بسر کی۔

ثناءاللہ امرتسری سے مباہلہ

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ثناءاللہ امرتسری سے مباہلہ چاہا تھا(دیکھیں کتاب انجام آتھم صفحات 72-67) جس کا اعتراف خود مولوی صاحب بھی کرتے ہیں۔ مولوی صاحب نے پہلے تو مباہلے کی حامی بھری لیکن بعد میں فرار کی وجہ اپنا غیر رسول ہونا بتایا(دیکھیں ان کی کتاب الہامات مرزا صفحہ 85)۔

اسی طرح نبی کے مخالف دو صورتوں میں ان کی زندگی میں ہی ہلاک ہوتے ہیں،ایک مباہلہ کے ذریعے اور دوسرا ایسی وعیدی پیشگوئی سے۔یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے تب بھی عرفان صاحب کہتے ہیں کہ دین میں اس کی کوئی بنیاد نہیں۔

اس حوالے سے سفید جھوٹ انھوں نے یہ نقل کیا ہے کہ مرزا صاحب ہیضہ سے فوت ہوئے جبکہ خود ڈاکٹر نے ڈیتھ سرٹیفیکیٹ میں اس کی وجہ آنتوں کی سوزش بتائی تھی۔اس کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ آپ علیہ السلام کے جسد اطہر کو ٹرین پر لیجایا گیا تھا جبکہ ہیضہ وغیرہ سے فوت ہونے والے کیلئے اس کی اجازت نہیں تھی۔

پیش گوئی طاعون

طاعون کی پیش گوئی کے حوالے سے اعتراض بھی ناقد صاحب کی کم علمی دکھاتا ہے۔ کیونکہ اول تو بائبل میں ہی مسیح کی آمد ثانی کے زمانے میں مری پڑنے کی پیش گوئی تھی۔دوم،وہ پنجاب کی طاعون کی شدت سے بھی آگاہ نہیں جس سے شہروں کے شہر اجڑے لیکن اس کے وسط میں ایک چھوٹی بستی محفوظ رہی۔اس پر وہ اعتراض کرتے ہیں کہ کلیتاً حفاظت کی پیش گوئی ہوتی تو حجت ہوتی جبکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ایسی پیش گوئیاں بھی موجود ہیں خصوصاً طاعون کے حوالے سے ہی حضور علیہ السلام نے اپنی چار دیواری میں موجود تمام افراد مع مہمانان کی کلیتاً حفاظت کی پیش گوئی فرمائی تھی جو پوری ہوئی۔

مباہلہ

اسی اعتراض کے تسلسل میں ناقد صاحب کہتے ہیں کہ مرزا صاحب مباہلہ کے موقع پر ایسا دعویٰ رکھتے تھے جو فوری نوعیت کا نہیں ہوتا تھا اور اس میں تاویل کی گنجائش رہتی تھی مثلاً یہ کہ جھوٹا سچے کی زندگی میں وفات پا جائے یا قرآن کی تفسیر فصیح عربی میں لکھنے کا مقابلہ کیا جائے۔ اس لئے یہ چیلنج ثبوت حق کی شہادت نہیں بن سکتے۔

ناقد صاحب نے یہاں بھی اپنی کم علمی کا ثبوت دیا ہے اور صاف کھل گیا ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریرات کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ مخالف لٹریچر سے ہی رائے قائم کی ہے۔ حق یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنے مخالفین کو مسنون مباہلے کیلئے ہی بلایا تھا۔ یعنی فریقین یہ دعا کریں کہ جو جھوٹا ہے اس پر خدا کی لعنت ہو (انجام آتھم، روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 65 تا 72) اور مباہلے کیلئے کم از کم دس افراد کی شرط رکھی تھی تا کہ قرآن مجید کے مطابق مکذبین کی پوری جماعت سے مباہلہ ہو اور تا ایک پوری جماعت پر عذاب نازل ہونے سے اس اشتباہ کا احتمال نہ رہے جو ایک شخص کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ نیز، مباہلے کے نتائج کی مدت بھی زیادہ سے زیادہ ایک سال ٹھہرائی تھی۔ (انجام آتھم، روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 317 تا 319) اس بیان سے عرفان صاحب کا سارا اعتراض ہی دم توڑ جاتا ہے۔

علاوہ ازیں، یہ کہنا بھی غلط ہے کہ جھوٹے کی سچے کی زندگی میں ہلاکت فوری نوعیت کی دلیل نہیں کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں ہی ایسے مقابلوں کے نتائج بھی فوراً برآمد ہوئے۔

فیصلے کے چھ طریق

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ہر گز کسی ایک طریق پر بھی اصرار نہیں کیا بلکہ آپ علیہ السلام نے متلاشیان حق کے لئے چھ طریق فیصلہ بیان فرمائے ہیں جن میں سے ایک مباہلہ بھی ہے:

اول، آپ علیہ السلام کے ایک عربی مکتوب جیسا فصیح کلام لکھ دے۔

اس پر معترض صاحب فرماتے ہیں کہ اس بات کا فیصلہ کیونکر ہو کہ کونسا کلام زیادہ فصیح ہے؟ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس کا جواب دیا ہے:

"۔۔۔ ایک مادری زبان والا جو عربی ہو قسم کھا کر اس کی تصدیق کر سکے (کہ کلام مخالف زیادہ فصیح ہے) تو میں کاذب ہوں۔" (انجام آتھم، روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 304)

عرفان صاحب اسے انسانی مداخلت قرار دیتے ہیں جس پر حیرت ہوتی ہے! کیا قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا فیصلہ اہل عرب نے نہیں کیا تھا؟ کیا اس گواہی کیلئے کوئی فرشتہ ان لوگوں کے سامنے ظاہر ہوا تھا؟

دوم، اگر یہ نشان منظور نہ ہو (جیسا کہ ناقد صاحب کو بھی منظور نہیں) تو صرف سات آیات کی تفسیر میں حقائق ومعارف کے بیان میں مقابلہ کرے۔

اگر فاضل ناقد کو فصاحت میں اشتباہ لگتا ہے (جس پر آگے بات کی جائے گی) تو حقائق ومعارف کا بیان ان کیلئے واضح تر دلیل ہو سکتی ہے۔

سوم، اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو کوئی نامی مولوی ایک سال تک آپ علیہ السلام کے پاس رہے، اگر انسانی طاقت سے برتر نشان ظاہر نہ ہو تو خواہ کذاب شمار کرے۔

چہارم، اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو کوئی نامی مخالف اشتہار دے کہ اس تاریخ سے ایک سال میں نشان ظاہر ہوا تو مصدق ہو جاؤں گا۔

پنجم، اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو نامور مخالفین مباہلہ کر لیں۔ "پس اگر مباہلہ کے بعد میری بد دعا کے اثر سے ایک بھی خالی رہا تو میں اقرار کروں گا کہ میں جھوٹا ہوں۔" (انجام آتھم، روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 304 تا 305)

ششم، اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو مخالفین سات سال تک صلح کا طریق اختیار کریں تو آپ علیہ السلام کے ذریعے خدا تعالیٰ اسلام کی تائید میں زبردست نشان ظاہر فرمائے گا۔

اب ہر ایک شخص مشاہدہ کر سکتا ہے کہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے ہر عذر کو رفع فرما دیا ہے اور طالبین حق کو ثبوت حق کی بہت سی راہیں دکھادی ہیں فہدیٰ للمتقین۔

اب ظاہر ہے کہ قلت تحقیق، مخالفین احمدیت پر اندھا اعتماد اور تکذیب کی جلدی عرفان صاحب کے آڑے آگئی۔

باب دوم: تسلسل نبوت

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ ہم نے ہر قوم میں نبی بھیجے۔ جن کا ایک مقصد اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنا اور دوسرا اس کے بندوں سے۔ ساری بشارات اور تمام ترانذار اسی لئے تھا۔ سو جب خدا تعالیٰ نے موسوی سلسلے کو قائم فرمایا تو انھیں توریت کی شکل میں شریعت عطا فرمائی۔ اور اسی دین موسوی کی ترویج، تجدید اور بنی اسرائیل کی اخلاقی اور روحانی تربیت نیز ایمان باللہ کے احیاء کیلئے پے در پے انبیاء بھیجتا رہا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلفاء تھے (المائدہ: 44)۔ یہ خلفاء مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں ضرورت کے مطابق آتے رہے اور کئی دفعہ ایک ہی وقت میں ایک سے زائد نبی مبعوث ہوئے (سلاطین اول 22:6)۔ یہاں تک کہ موسوی سلسلے کا خاتم الخلفاء ظاہر ہو گیا جو تمام گزشتہ خلفاء سے بڑھ کر تھا یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ ان سب خلفاء نے مسیح علیہ السلام کے زمانے کی خبر لوگوں کو دی تھی اور انھیں اس کیلئے تیار بھی کیا تھا۔ اس آنے والے نے اپنے بعد ایک اور وجود کی پیش گوئی کی جس کا ظہور ہمارے آقا و مولا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شکل میں ہوا (یوحنا باب 16)۔ اور جس کی خبر تورات میں مثیل موسیٰ کے طور پر درج تھی (استثناء 18:18)۔ یہاں سے خدا تعالیٰ نے سلسلہ محمدیہ قائم فرمایا اور جیسا کہ اس نے آنحضرت ﷺ کو مثیل موسیٰ قرار دیا تھا (المزمل: 15)، اس سلسلے کے خلفاء کو بھی گزشتہ خلفاء کا مثیل قرار دیا (النور: 55)۔ ان کا کام بھی دین محمدی کی ترویج، تجدید اور مسلمانوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت نیز ایمان باللہ کا احیاء تھا۔ ان کی کرامات معجزات کی قائم مقام اور ان کے الہامات وحی کے قائم مقام ہوئے۔ یہ وجود آنحضرت ﷺ کے فرمان کے مطابق امت میں کثرت سے ہوئے۔ فرق صرف یہ تھا کہ موسوی خلفاء نے نبی کا نام پا کر یہ فرائض انجام دئے جبکہ محمدی خلفاء نے بغیر یہ نام پائے (بخاری: 3455)۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ جن خلفاء کی بشارت آنحضرت ﷺ نے محولہ بالا حدیث میں دی تھی وہ محض سیاسی رہنما ہی تھے، یہ بات تبھی غلط ثابت ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ موسوی خلفاء/انبیاء بادشاہ نہیں تھے سوائے دو چار کے۔ اس فہم کی مزید تصدیق ان روایات سے بھی ہو جاتی ہے جہاں آنحضرت ﷺ نے انہی خلفاء کو ایک جگہ مجدد قرار دیا ہے (ابوداؤد: 4291) تو دوسری جگہ انھیں علماء کے نام سے یاد کیا ہے (علماء أمتي كأنبياء بني إسرائيل) جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بنیادی طور پر دینی شخصیات ہی ہیں اور اگر کسی کو حکمرانی میسر آئے تو یہ ایک اضافی امر ہے۔ یہ خلفاء بھی موسوی خلفاء کی طرح ضرورت کے تحت مختلف علاقوں میں آتے رہے اور کئی مرتبہ ایک ہی وقت میں ایک سے زائد خلفاء بھیجے گئے۔ چنانچہ ان مجددین نے محمدی سلسلے کے خاتم الخلفاء یعنی مسیح موعود کے زمانے کیلئے لوگوں کو مسلسل تیار کیا جس کی بشارت سورۃ جمعہ میں خود اللہ تعالیٰ نے دی تھی اور آنحضرت ﷺ کی احادیث بھی اس کی نوید سنا رہی تھیں۔ جیسے آپ ﷺ نے نبی اللہ فرمایا تھا (مسلم: 2937 a) اور جس کے متعلق فرمایا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی نبی نہیں (ابوداؤد: 4324)۔ پھر جیسے آنحضرت ﷺ مثیل موسیٰ اور محمدی خلفاء موسوی خلفاء کے مثیل تھے، اس سلسلے کا سب سے

عظیم خلیفہ بھی مثیل مسیح ہوا۔ جس پر مزید دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کی خبر دیتا ہے اور آنحضرت ﷺ ایک مسیح کی آمد کی۔ دونوں کو یکجا کر کے دیکھنے سے معاملہ صاف ہو جاتا ہے کہ آنے والا مسیح امت محمدیہ سے ہی ہو گا جیسا کہ بخاری کی حدیث میں اس کے متعلق "إمامکم منکم" یعنی تمھارا امام تمھیں میں سے ہو گا کے الفاظ آئے ہیں۔ پھر آنحضرت ﷺ نے موسوی مسیح کا حلیہ اور بیان فرمایا ہے اور آنے والے مسیح کا حلیہ اور (بخاری 3438، 3440)۔ جس سے ظاہر ہے کہ آنے والا مسیح امتی نبی ہے، اسرائیلی نبی نہیں۔ اس بات کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سلسلہ محمدیہ کو ہمیشہ کیلئے قائم فرمادیا اور دین محمدی کو کامل فرمادیا۔ اس لئے کوئی تشریعی نبی (نئی شریعت لانے والا) نہیں آسکتا۔ چنانچہ یہی مفہوم نبوت کی عمارت کو مکمل کرنے کا ہے اور یہی مفہوم لا نبی بعدی کا ہے۔ اور علماء، حدیث "لا نبی بعدی" اور حدیثِ مسلم میں آنے والے مسیح کو "نبی اللہ" فرمانے کی تطبیق اسی طرح کرتے آئے ہیں۔

لیکن بشمول آیت خاتم النبیین قرآن مجید میں کہیں بھی مطلقاً نبوت کے انقطاع کا تصور نہیں پایا جاتا بلکہ اس کے برعکس کئی ایک مقامات سے امتی انبیاء کے آنے کی ہی تثویب ہوتی ہے اور امت محمدیہ سے ان پر ایمان لانے کا عہد بھی لیا گیا ہے جو آگے تفصیلاً بیان کیا جائے گا۔

عرفان صاحب نے بیان کیا ہے کہ ماضی میں ایک نبی کی تصدیق سے ہی دوسرا نبی آیا کرتا تھا نیز آنے والے نبی کا ذاتی اور صفاتی نام لے کر پیش گوئیاں کی جاتی تھیں۔ انھوں نے تصور انبیاء کا یہ انوکھا مقدمہ بائبل سے قائم کرنا چاہا ہے جس کا نہ تو کوئی ثبوت انھوں نے پیش کیا ہے اور نہ موجود ہی ہے۔ پورا عہد عتیق/تناخ پڑھ جایئے، یہ بات نہیں ملے گی کہ ایک نبی کی تصدیق سے ہی اگلا نبی آتا تھا، نہ یہ کہ ہر نبی کا ذاتی اور صفاتی نام وصفات بتا کر پیشگوئی کی جاتی تھی۔ قرآن مجید بھی اس بیان سے خالی ہے جو مثالیں انھوں نے پیش کی ہیں ان میں دراصل حضرت ابراہیم اور حضرت زکریا علیہم السلام کو ان کی اولاد کی خوشخبری دی جارہی ہے نہ کہ کسی نبی کی پیشگوئی جس کی منادی ان پر لازم ہو۔ سو ان کا یہ مقدمہ تو سرے سے قائم ہی نہیں ہوتا چہ جائیکہ کوئی تواتر ہو۔

پھر ان کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیش گوئی ان کے خاص صفاتی نام "مسیح" سے کی گئی ہے۔ درحقیقت، یہ ویسی ہی پیش گوئی تھی جیسی اسلام میں موجود تھی۔ صفات بھی ویسی ہی تھیں جیسی قرآن وحدیث میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ حزقیل نبی کی معرفت لکھا ہے:

اور میرا بندہ داؤد اُن کا بادشاہ ہوگا اور اُن سب کا ایک ہی چرواہا ہوگا اور وہ میرے احکام پر چلیں گے اور میرے آئین کو مان کر اُن پر عمل کریں گے۔ اور وہ اُس ملک میں جو میں نے اپنے بندہ یعقوب کو دِیا جس میں تُمھارے باپ دادا بستے تھے بسیں گے اور وہ اور اُن کی اَولاد اور اُن کی اَولاد کی اَولاد ہمیشہ تک اُس میں سکُونت کریں گے اور میرا بندہ داؤد ہمیشہ کے لئے اُن کا فرمانروا ہوگا۔ اور میں اُن کے ساتھ سلامتی کا عہد باندھُوں گا جو اُن کے ساتھ ابدی عہد ہوگا اور میں اُن کو بساؤں گا اور فراوانی بخشُوں گا اور اُن کے درمیان اپنے مقدس کو ہمیشہ کے لئے قائم کرُوں گا۔ میرا خیمہ بھی اُن کے ساتھ ہوگا۔ میں اُن کا خُدا

ہُوں گا اور وہ میرے لوگ ہوں گے۔ اور جب میرا مقدس ہمیشہ کے لئے اُن کے درمیان رہے گا تو قومیں جانیں گی کہ میں خُداوند اسرائیل کو مقدّس کرتا ہُوں۔ (حِزقی ایل 37:24-28)

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اس بابت پوچھا گیا تو ان کا جواب تھا کہ میری بادشاہی اس دنیا کی نہیں (یوحنا 18:36) نیز فرمایا کہ میں ہی ہیکل/مقدس ہوں (یوحنا 2:22)۔ لیکن یہود نے انھیں دور از کار تاویلات قرار دیا جیسا کہ ناقد صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تشریحات کو قرار دیتے ہیں۔ اس پر مزید تعجب یہ ہے کہ وہ خود بھی قبول کرتے ہیں کہ آمد مسیح اس امت میں سے ہی کسی شخص کی صورت میں ہو گی، اس استنباط میں انھوں نے یقیناً اُن تفہیمات کو قبول کیا ہے جنھیں وہ پہلے دور از کار تاویلات کہہ کر جھٹلا چکے تھے۔ لہٰذا ان کی فکر میں بھی تضاد نمایاں ہے۔

علاوہ ازیں، احادیث میں موجود مسیح کی پیشگوئی کے حوالے سے ان کا یہ کہنا کہ ایسا دعویٰ کوئی بھی کر سکتا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کی باری اسے ان کا صفاتی نام قرار دینا، بھی ایک تناقض ہے۔ شاید انھیں معلوم نہیں ہے یہود کے ہاں بھی مسیح ایک ٹائٹل ہی ہے جس کے دعویدار اب تک بہت سے ہو چکے ہیں جن میں سے ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔

اسی طرح یہ کہنا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیشگوئی ان کا نام لے کر کی گئی تھی، یہ بات بھی ناقد صاحب کی کم علمی دکھاتی ہے۔ دراصل، بائبل میں ذکر ہے کہ ایلیا/الیاس علیہ السلام آتشی رتھ میں بیٹھ کر آسمان پر چلے گئے (سلاطین دوم 2:11) اور خدا کے جلالی دن آنے سے پیشتر ان کی آمد ثانی ہو گی (ملاکی 4:5)۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا تو یہود نے ان سے استفسار کیا کہ اگر تو مسیح ہے تو ایلیا کہاں ہے؟ جس پر انھوں نے فرمایا کہ یوحنا/یحییٰ ہی ایلیا ہے (متی 11:14)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء کی آمد ثانی روحانی ہوتی ہے جسمانی نہیں یعنی کوئی شخص انہی کے رنگ میں ہو کر آتا ہے، یہی دلیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی اور یہی دلیل حضرت مرزا صاحب علیہ السلام نے دی۔ لیکن یہود نے اسے دور از کار تاویل کہہ کر رد کر دیا جیسا کہ عرفان صاحب نے کیا ہے۔ اور اگر عرفان صاحب برا نہ مانیں تو میرا تاثر یہ ہے کہ اگر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ہوتے تو ان کے رویے سے ظاہر ہے کہ یہود کے ساتھ ہی کھڑے ہوتے۔

یہود کی آزمائش مسلمانوں سے بڑھ کر تھی کیونکہ علاوہ دیگر قرائن کے قرآن مجید میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کی خبر موجود ہے جس سے مسلمانوں کو اس بات کے سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہو سکتی تھی کہ آنے والا مسیح پرانا نہیں بلکہ نیا ہے جبکہ بائبل حضرت الیاس کے صعود آسمانی کی خبر تو دیتی ہے، وفات کا کوئی ذکر نہیں کرتی۔

تسلسل نبوت کی آیات کے حوالے سے عرفان صاحب نے اپنے نقد کی ابتدا سورۃ اعراف کی آیت 35 سے کی ہے۔

امت محمدیہ میں انبیاء کی خوشخبری

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ یَقُصُّوۡنَ عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ ۙ فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۵﴾ وَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ اسۡتَکۡبَرُوۡا عَنۡہَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۳۶﴾

"اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تمھی میں سے رسول آئیں تم کو میری آیات سناتے تو جو ڈرا اور جس نے اصلاح کر لی، ان کیلئے نہ خوف ہو گا اور نہ وہ غمگیں ہوں گے۔ اور جو میری آیات کو جھٹلائیں گے اور تکبر کر کے ان سے اعراض کریں گی، وہی دوزخ والے ہیں، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔" (تدبر قرآن)

فاضل ناقد لکھتے ہیں: "احمدی حضرات کا کہنا ہے کہ یہاں خدا تمام بنی آدم سے مخاطب ہو کر رسولوں کی آمد کی خبر دے رہا ہے۔ چنانچہ جب تک بنی آدم دنیا میں موجود ہیں، رسول بھی آتے رہیں گے۔"

آگے لکھتے ہیں: "اس آیت میں غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہاں اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہے کہ رسول آتے رہیں گے، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ "اگر" رسول آئے تو تمھارا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ اگر یہ کہنا ہوتا کہ رسول مسلسل آتے رہیں گے، تو اس کیلئے یہ اسلوب اختیار نہ کیا جاتا۔"

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ جب آیت خاتم النبیین سے نبیوں کا آنا موقوف ہو گیا تو خدا کو اس آیت کے تحت پابند نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نبیوں کی آمد کا امکان بنائے رکھے۔

یہاں فاضل ناقد کو دو باتوں میں غلطی لگی ہے۔ ایک تو اس آیت کی تفہیم میں اور دوسری اس آیت کو اپنے تصور ختم نبوت کی روشنی میں سمجھنے میں۔ پہلے دوسرے نکتے پر بات کرتے ہیں۔

عرفان شہزاد صاحب نے اپنے مضمون میں یہ ترتیب اختیار کی ہے کہ پہلے عمومی طور پر تسلسل انبیاء کی آیات پر بحث کی ہے، اس کے بعد کسی خاص نبی/مسیح کے آنے کے قرآنی امکان پر بات کی ہے اور آخر میں آیت خاتم النبیین سے نتیجہ اخذ کیا ہے۔ یہ بالکل درست ترتیب ہے۔ لیکن سورۃ اعراف کی اس آیت پر بحث کرتے ہوئے ان سے غلطی یہ ہوئی ہے کہ آیت خاتم النبیین سے اخذ کردہ جس نتیجے کو ثابت کرنا تھا اسی کو ثبوت کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اگر یہی کرنا تھا تو ان پہلے دو حصوں کی ضرورت ہی کیا تھی، ان پر کیوں صفحے کے صفحے سیاہ کئے گئے؟ تب تو انھیں چاہیے تھا کہ صرف آیت خاتم النبیین پر بحث کرتے اور نتیجہ نکال لیتے۔ اور اس کے بعد یہ لکھ دیتے کہ دوسری ہر آیت کو ہمارے اس نتیجے کے تناظر میں دیکھا جائے۔ جیسا کہ غامدی صاحب کرتے ہیں۔ لیکن اگر انھوں نے ایک ترتیب قائم کی تھی تو چاہئے تھا کہ اس کا لحاظ بھی رکھتے۔ اس سے ان کے استدلال کی کمزوری واضح ہو جاتی

ہے کہ ان کے پاس آیت خاتم النبیین کے علاوہ کوئی آیت ثبوت کیلئے موجود نہیں اور دوسری بہت سی آیات ان کے تصور ختم نبوت سے میل نہیں کھاتیں اس لئے ان آیات کو آیت خاتم النبیین سے منسوخ قرار دینا پڑتا ہے۔ خیر اصل مضمون کی طرف بڑھتے ہیں۔

اب اس آیت کی درست تفہیم بیان کی جاتی ہے۔ سورۃ اعراف کی مندرجہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے دراصل سورۃ بقرۃ کی آیت 38 اور 39 (اور طہ کی آیات 123 اور 124) میں موجود حکم کو کچھ اضافے کے ساتھ نئے سرے سے دہرایا ہے۔ سورۃ بقرۃ میں مذکور یہ حکم تب صادر ہوا جب بنی آدم میں سلسلہ نبوّت کی ابتدا کی جارہی تھی، فرمایا:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

"ہم نے کہا: اترو یہاں سے سب! تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کیلئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگیں ہوں گے۔ اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے میری آیتوں کو، وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔" (تدبر قرآن)

غامدی صاحب کے استاذ امین احسن اصلاحی صاحب اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "فَاِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى (تو اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت): یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کے لئے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کرنے کا پہلا وعدہ ہے۔" آیات کا یہ مفہوم ہمیشہ سے متفق علیہ ہے۔

اب ہم ان آیات پر عرفان شہزاد صاحب کی اوپر بیان کی گئی تنقید ہو بہو لا گو کرتے ہیں: "اس آیت میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہے کہ ہدایت آتی رہے گی، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ "اگر" ہدایت آئے تو تمھارا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ اگر یہ کہنا ہوتا کہ ہدایت مسلسل آتی رہے گی، تو اس کیلئے یہ اسلوب اختیار نہ کیا جاتا۔"

اب میں ہر منصف مزاج قاری سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا کسی کو بھی یہ نتیجہ قبول ہوگا؟ جبکہ اسلوب بھی وہی ہے اور بات بھی وہی جو سورۃ اعراف میں بیان ہوئی ہے۔ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ بنی آدم میں سلسلہ انبیاء جاری فرمانے کی نوید سنا رہا ہے۔

بعینہ یہی بات قیامت تک آنے والے تمام اہلِ ایمان بنی آدم کو مخاطب کر کے سورۃ اعراف میں دہرائی گئی ہے۔ سو جیسے یہاں ہدایت کے مسلسل آنے کی نوید ہے نہ کہ کسی روپے کی بات ہو رہی ہے، بالکل ویسے ہی سورۃ اعراف میں بھی مسلسل رسولوں کے آنے کی نوید ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ سورۃ بقرۃ میں عمومی طور پر ہر قوم سے رسولوں کا آنا بیان فرمایا تھا جبکہ سورۃ اعراف میں یہ بشارت صرف آنحضرت ﷺ کی امت کیلئے ہے۔ کیونکہ اگرچہ یہاں بھی بنی آدم کے الفاظ ہی آئے ہیں لیکن سیاق و سباق سے واضح ہے کہ مخاطب صرف مسلمان ہیں (دیکھیں آیت 31)۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اب جو رسول آئیں گے امت محمدیہ میں سے ہی آئیں گے۔ نیز ساتھ یہ اضافہ بھی فرمادیا کہ اب جن رسولوں کے آنے کی بشارت دی جاتی ہے وہ "میری آیات پڑھتے ہوئے" آئیں گے۔ اس خاص سیاق و سباق میں آیات سے مراد قرآنی آیات ہیں۔ چنانچہ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ رسول قرآن مجید کی ہی تعلیم دیں گے نہ کہ اس کے مقابل کوئی اور کتاب لائیں گے، غیر تشریعی اور آنحضرت ﷺ کے متبعین ہوں گے جیسا کہ تسلسل انبیاء کی دیگر آیات سے بھی ثابت ہوتا ہے جن کا ذکر آئندہ اقساط میں کیا جائے گا۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ سورۃ بقرۃ میں اس ہدایت کے ساتھ "اگر" کا لفظ کیوں ہے یعنی جملہ شرطیہ کیوں ہے؟ اور جملہ شرطیہ کی جو مثال فاضل ناقد نے بیان کی ہے وہ کسی طرح بھی آیات مذکورہ سے میل نہیں کھاتی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اگر وہ لاہور آئے تو فلاں شخص سے ملیں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہو سکتا ہے وہ آئیں یا شاید نہ آئیں۔ لیکن اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا ہر گز یہ منشا نہیں کہ شاید ہدایت آئے یا شاید نہ آئے کیونکہ اگر یہ مطلب لیا جائے تو آیت کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے جو کہ سلسلہ نبوّت جاری کرنا ہے۔ شرطیہ ہونے کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ اگر تم اس نبی کے زمانے کو پاؤ۔ یعنی ہدایت تو مسلسل آتی رہے گی لیکن اگر تم اسے پاؤ تو قبول کرنا رد نہ کر دینا۔

بعینہ یہی حکم یہاں سورۃ اعراف میں بھی ہے۔ اب امت محمدیہ کیلئے نبوت کے اس اجرا کی تجدید کی گئی ہے۔ تا کہ انھیں یاد دہانی ہو کہ ان کیلئے بھی وہی حکم ہے جو ہمیشہ سے بنی آدم کیلئے رہا ہے۔ بہر حال آیت زیرِ بحث سے تسلسل نبوت صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی اتباع: نبوت کی بنیادی شرط

(گو عرفان شہزاد صاحب نے اپنے مضمون میں اس آیت پر بحث نہیں کی لیکن چونکہ یہ ہمارے استدلال کی بنیادی آیات میں سے ہے، اس لئے پیش کی جاتی ہے۔) سورۃ نساء کی آیت 69 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾

"اور جو بھی اللہ کی اور اِس رسول کی اطاعت کرے گا تو یہی وہ لوگ ہیں جو اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے (یعنی) نبیوں میں سے، صدیقوں میں سے، شہیدوں میں سے اور صالحین میں سے۔ اور یہ بہت ہی اچھے ساتھی ہیں۔"

"اس آیت میں بہت سے قابل توجہ امور ہیں۔ پہلا یہ کہ الرسول سے مراد آنحضرت ﷺ ہیں یعنی یہ خاص رسول۔

دوسرا یہ کہ اگر تم اس رسول کی اطاعت کرو گے تو ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جن میں نبی بھی شامل ہیں اور صدیق بھی اور شہید بھی اور صالح بھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی متابعت میں نبی بھی آسکتا ہے، یعنی وہ جو اس رسول کی اطاعت کرنے والا ہو۔

اس جگہ مع کے معنے بعض علماء کی طرف سے اصرار کے ساتھ یہ کئے جاتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ ہوں گے اور ان میں سے نہیں ہوں گے۔ اس کی تائید میں وہ کہتے ہیں کہ حَسُنَ أُولَئِكَ رَفِيقًا فرمایا ہے کہ وہ بہترین ساتھی ہوں گے یعنی وہ نبیوں کے ساتھ ہوں گے خود نبی نہ ہوں گے۔ اس آیت کا یہ ترجمہ آنحضرت ﷺ کی شدید گستاخی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اس آیت کا مطلب یوں بنے گا کہ آنحضرت ﷺ کی اطاعت کرنے والے نبیوں کے ساتھ ہوں گے مگر خود نبی نہ ہوں گے۔ وہ صدیقوں کے ساتھ ہوں گے مگر خود صدیق نہ ہوں گے۔ وہ شہیدوں کے ساتھ ہوں گے مگر خود شہید نہ ہوں گے۔ وہ صالحین کے ساتھ ہوں گے مگر خود صالح نہ ہوں گے۔ قرآن مجید کی کئی آیات میں مَعَ کا لفظ مِنْ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً دیکھیں آل عمران: ۱۹۴۔ النساء: ۱۴۷۔ الحجر: ۳۲

علاوہ ازیں یہاں مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِمْ کے بعد مِنَ النَّبِيِّينَ فرمایا گیا ہے۔ یہ من بیانیہ کہلاتا ہے، مراد ہے ان کے ساتھ یعنی ان میں سے۔"

(قرآن کریم اردو ترجمہ مع سورتوں کا تعارف اور مختصر تشریحی نوٹس، حضرت مرزا طاہر احمد خلیفۃ المسیح الرابع)

ہمارے اس نقطہ نظر کی تفصیل درج ذیل ہے:

اول، لغت سے مع کے ان معنوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ امام راغب نے مفردات القرآن میں مع کے تحت یہ پانچ معانی درج کئے ہیں:

مع مکانی، مع زمانی، مع معنوی یعنی رشتے میں معیت، مرتبے میں معیت اور مع بمعنی نصرت

ہمارے نزدیک اس آیت مبارکہ میں درجے اور رتبے میں معیت مراد ہے۔ امام راغب کی بھی یہی رائے ہے:

"راغب نے کہا ہے یعنی ان چار گروہوں کے ساتھ درجہ اور ثواب میں شامل کردے گا جن پر اس نے انعام کیا ہے۔اس طرح کہ جو تم میں سے نبی ہو گا اس کو نبی کے ساتھ ملادے گا اور جو صدیق ہو گا اسے صدیق کے ساتھ ملادے گا اور شہید کو شہید کے ساتھ ملادے گا اور صالح کو صالح کے ساتھ ملادے گا۔"

(تفسیر بحر المحیط جلد 3 صفحہ 287)

دوم، قرآن مجید سے بھی مع کے اس معنی کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر دو آیات ملاحظہ ہوں:

سورۃ آل عمران کی آیت 193 میں فرمایا: تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ اور ہمیں موت اپنے وفادار بندوں کے ساتھ دے۔ یعنی اس حال میں موت دے کہ ہم تیرے وفادار بندوں میں شامل ہوں نہ یہ کہ جب تیرے وفادار بندے فوت ہوں تو ساتھ ہی ہمیں بھی وفات دے دے۔

سورۃ النساء کی آیت 146 میں فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ البتہ جو توبہ اور اصلاح کرلیں گے اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑیں گے اور اپنی اطاعت کو اللہ کیلئے خالص کرلیں گے، وہ ایمان والوں کے ساتھ ہوں گے۔ یعنی توبہ کرنے والے خود مومنین بن جاتے ہیں نہ کہ صرف پہلے مومنوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

سب سے اہم اور فیصلہ کن امر یہ ہے کہ خود قرآن مجید ہی ہمارے ان معنوں کی تصدیق کرتا ہے اور ہر دوسرے معنی کی تردید کردیتا ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت 19 میں لکھا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ٭ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۹﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر، وہی لوگ اپنے رب کے ہاں، صدیقوں اور شہداء کے زمرے میں ہوں گے۔ان کیلئے ان کا صلہ بھی ہو گا اور ان کی روشنی بھی۔رہے وہ جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کی تکذیب کی، وہ جہنم والے بنیں گے۔

امین احسن اصلاحی صاحب اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

منافقین کو ایک تنبیہ: یہ منافقین کو بتایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیقین اور شہداء کے لیے جو درجے ہیں وہ ہر مدعیٔ ایمان کو نہیں حاصل ہو جائیں گے بلکہ یہ صرف ان لوگوں کے لیے خاص ہیں جو اللہ اور اس کے رسولوں پر سچا اور پکا ایمان لائیں گے اور اپنے عمل سے اپنے دعوائے ایمان کی صداقت ثابت کریں گے۔۔اور وہی لوگ ہیں جن کو صدیقین اور شہداء کے زمرے میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہو گی۔۔بعینہٖ یہی بات ان منافقین ہی کو

خطاب کر کے سورۂ نساء میں یوں فرمائی گئی ہے: وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (النساء ۴: ۷۰) ''اور جو پوری وفاداری سے اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہی لوگ اللہ کے انعام یافتوں: انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوں گے۔''

ہم اس سے زائد کیا کہتے ہیں؟ ہم بھی تو یہی کہہ رہے ہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر صحیح معنوں میں ایمان لائیں گے اور پوری وفاداری سے اطاعت کریں گے، انھیں انعام کے حصول میں انہی لوگوں کی معیت حاصل ہو جائے گی۔ آیت مذکورہ بالا نے اس کی تصریح کر دی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ فضیلت صرف ہمارے سید و مولا حضرت محمد ﷺ کے حصے میں آئی ہے کہ ان کی اتباع سے نبوت کا مقام بھی عطا کیا جاتا ہے۔ دراصل، یہ دونوں آیات ایک دوسرے کی تفسیر ہیں اور ایک کا اجمال یا بظاہر ابہام دوسری سے زائل ہو جاتا ہے۔

اس آیت کے حوالے سے فاضل ناقد نے ایک طرف تو یہ تسلیم کیا ہے کہ صدیقین، شہدا اور صالحین کے گروہ میں شامل ہونا ممکن ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ یہاں "مع" کے معنی "شامل ہونا" ہی کرتے ہیں، دوسری طرف مع کے انہی معنوں پر تنقید بھی کرنی چاہی ہے۔ ایسا تناقض ان کی تحریروں میں کئی جگہ پایا جاتا ہے۔

غرض یہ آیت مبارکہ بھی آنحضرت ﷺ کی اتباع میں انبیاء کا آنا ثابت کرتی ہے۔

آئندہ انبیاء پر ایمان لانے کے متعلق امت مسلمہ سے عہد

سورۃ آل عمران میں فرمایا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

"اور جب اللہ نے نبیوں کا میثاق لیا کہ جبکہ میں تمھیں کتاب اور حکمت دے چکا ہوں پھر اگر کوئی ایسا رسول تمھارے پاس آئے جو اس بات کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لے آؤگے اور ضرور اس کی مدد کروگے۔ کہا کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس بات پر مجھ سے عہد باندھتے ہو؟ انھوں نے کہا (ہاں) ہم اقرار کرتے ہیں۔ اس نے کہا پس تم گواہی دو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔ پس جو کوئی اس کے بعد پھر جائے تو یہی ہیں جو فاسق ہیں۔" (ترجمہ حضرت مرزا طاہر احمد رحمہ اللہ)

ان آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر نبی سے اس کی قوم کی نمائندگی میں اس بات پر عہد لیا گیا ہے کہ وہ آنے والے رسولوں پر ایمان لائیں گے۔ (آنحضرت ﷺ سے بھی یہ عہد لیا گیا ہے دیکھیے سورۃ احزاب آیت 7۔ جس سے آنحضرت ﷺ کے بعد بھی نبیوں کا آنا ثابت ہوتا ہے۔) یہاں مقصود اہل کتاب کو اس عہد کی یاد دہانی ہے جس کے مطابق آنحضرت ﷺ اُن پیش گوئیوں کا مصداق بن کر تشریف لائے جو ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔

عرفان شہزاد صاحب لکھتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ کے سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصدر مفعول کی طرف اضافت ہے یعنی نبیوں سے نہیں بلکہ ان کی قوموں سے عہد لیا گیا ہے۔ کیونکہ تمام تر سیاق و سباق میں بنی اسرائیل سے ہی خطاب ہے۔ پھر نبیوں کا بعثت محمدی کے وقت موجود ہونا ممکنات میں سے ہے تو لا محالہ عہد ان کی قوم سے ہی ہوا۔ علاوہ ازیں، عہد کی پاسداری نہ کرنے پر جو لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے وہ نبیوں کے ساتھ موزوں نہیں۔

اس استدلال میں یہ تصور کیا گیا ہے کہ اگر عہد نبی سے لیا گیا ہو تو اس کی قوم اس عہد سے خارج ہو جاتی ہے جس سے وہ مسائل جنم لیتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یہی بنیادی غلط فہمی ہے۔ قرآن مجید کا یہ اسلوب ہے کہ بظاہر خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہوتا ہے لیکن اس حکم میں تمام لوگ شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً سورۃ طلاق آیت 1 میں فرمایا يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ یعنی اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے حساب سے طلاق دو۔ یہاں گو خطاب آنحضرت ﷺ سے ہے لیکن اگلے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اس حکم میں تمام مسلمان شامل ہیں۔ اس خطاب کی اہمیت میں امین احسن اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

"نبی صلعم سے خطاب کی اہمیت: تمہید میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب شخصاً نہیں بلکہ امت کے وکیل کی حیثیت سے ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ کو خطاب کرنے کے بعد معاً 'طَلَّقْتُمُ' میں ضمیر خطاب جمع آگئی ہے جس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہاں جو احکام دیے جا رہے ہیں وہ ہیں تو تمام مسلمانوں کے لیے البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ احکام دینے سے ان کی اہمیت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بہت بڑھ گئی

ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ لوگوں کے اندر ان کی عظمت کا احساس پیدا ہو کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ان باتوں کی پابندی لازمی ہے تو دوسروں پر تو بدرجہا زیادہ ہو گی۔"

بعینہ یہی اسلوب زیرِ بحث آیات میں اختیار کیا گیا ہے اور انبیاء سے خطاب کا مقصد بھی یہی ہے۔ یعنی اگرچہ عہد نبیوں سے لیا گیا ہے لیکن اپنی قوم کے وکیل کی حیثیت سے اور اصل خطاب قوم سے ہی ہے جیسا کہ بعد کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ دوسرے لفظوں میں، انبیاء کے ذریعے ان کی قوموں سے عہد لیا گیا ہے۔ اس طرح وہ تمام دشواریاں آپ سے آپ ختم ہو جاتی ہیں جن کا ذکر عرفان شہزاد صاحب نے کیا ہے اور قرآن مجید کا اسلوب بھی قائم رہتا ہے۔

اب آتے ہیں دوسری آیت مبارکہ کی طرف جس میں آنحضرت ﷺ سے بھی یہ عہد لینے کا تذکرہ ہے۔ سورۃ احزاب میں فرمایا:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۖ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۷﴾ لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۸﴾

اور جب ہم نے نبیوں سے ان کا عہد لیا اور تجھ سے بھی اور نوح سے اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے۔ اور ہم نے ان سے بہت پختہ عہد لیا تھا۔ تاکہ وہ سچوں سے ان کی سچائی کے متعلق سوال کرے اور کافروں کے لئے اس نے دردناک عذاب تیار کیا ہے۔ (ترجمہ از حضرت مرزا طاہر احمد رحمہ اللہ)

کہا جاتا ہے کہ اس آیت کا سیاق و سباق اجازت نہیں دیتا کہ یہاں وہی عہد مراد لیا جائے جو سورۃ آل عمران میں مذکور ہے۔ مثلاً اگلی ہی آیت میں فرمایا ہے کہ تاکہ خدا سچوں سے ان کی سچائی کے متعلق سوال کرے۔ یہ سوال اتمام حجت کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں انبیاء سے اس بات کا عہد لیا گیا ہے کہ وہ پیغام خداوندی کو بے کم و کاست پہنچائیں گے۔

ہمارا موقف یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں دو جگہ ہی میثاق النبیین کا ذکر ہے۔ ایک سورۃ آل عمران میں اور دوسرا اس آیت میں۔ اس لئے اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو دونوں جگہ ایک ہی عہد مراد ہونا چاہئے۔ جیسا کہ ہم واضح کئے دیتے ہیں۔ آل عمران میں مذکور میثاق کا مدعا بتمام و کمال اس آیت پر بھی لاگو ہوتا ہے اور یہ سیاق و سباق سے متعارض بھی نہیں ہے۔ یہاں کافروں اور منافقوں کو یاد دلایا گیا ہے کہ جس نبی کی تکذیب و تحقیر کے تم مرتکب ہوتے ہو اسی پر ایمان لانے اور اس کی مدد کرنے کا عہد تمہارے نبیوں سے لیا گیا تھا۔ یہ نبی اسی عہد کے مطابق اُن پیش گوئیوں کا مصداق بن کر آیا ہے جو تمہاری کتابوں میں موجود ہیں۔ لیکن تم فسق کی راہ اختیار کرتے ہوئے اس عہد سے پھر گئے اور اس رسول ﷺ کو اپنے بیٹوں کی طرح پہچان لینے کے باوجود

تکذیب و تحقیر پر کمربستہ رہے۔ سو یہ عہد اسی لئے لیا گیا تھا تا خدا سچوں سے ان کی سچائی کے متعلق سوال کرے اور کافروں کیلئے اُس دن عذاب ہے۔ یہ نظم کلام کی رعایت سے اس آیت کی تشریح ہے جس کی تصدیق اگلی چند آیات سے ہو جاتی ہے:

مِّنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا۟ مَا عَٰهَدُوا۟ ٱللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُۥ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوا۟ تَبْدِيلًا ـ لِّيَجْزِيَ ٱللَّهُ ٱلصَّٰدِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ ٱلْمُنَٰفِقِينَ إِن شَآءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا

مومنوں میں ایسے مرد ہیں جنہوں نے جس بات پر اللہ سے عہد کیا تھا اُسے سچا کر دکھایا۔ پس اُن میں سے وہ بھی ہے جس نے اپنی منّت کو پورا کر دیا اور ان میں سے وہ بھی ہے جو ابھی انتظار کر رہا ہے اور انہوں نے ہر گز (اپنے طرز عمل میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔ (یہ اس لئے ہے) تا کہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزا دے اور منافقوں کو اگر چاہے تو عذاب دے یا توبہ قبول کرتے ہوئے اُن پر جھکے۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ (الاحزاب:23-24)

دیکھئے یہاں مؤمنین کے متعلق نہ صرف آیات میثاق کے وہی الفاظ دہرائے گئے ہیں جنھیں بنیاد بنا کر معترض اس میثاق کو انبیاء سے خاص کرنا چاہتے تھے بلکہ یہاں اسی میثاق کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ سورۃ آل عمران کی طرح یہاں بھی انبیاء سے نہیں بلکہ ان کی امت سے عہد لیا گیا ہے۔

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک، یہی عہد آنحضرت ﷺ سے بھی لیا گیا ہے۔ اس سے مؤمنین کیلئے یاد دہانی ہے کہ وہ بھی آئندہ انبیاء کے متعلق انہی کافروں جیسا رویہ اختیار نہ کریں۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن مجید نے خود تخصیص کر دی ہے کہ اب آنحضرت ﷺ کے متبعین میں سے ہی نبی آسکتا ہے آپ ﷺ کی شریعت کی پیروی کرتے ہوئے، جیسا کہ پیچھے ثابت کیا گیا ہے۔

دوسرا، یہاں جلیل القدر انبیاء کے تذکرے سے مخاطبین پر اتمام حجت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کے مدعی تھے اور یہود و نصاریٰ بالترتیب موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کی۔ یعنی جن انبیاء کی اتباع کا تمھیں دعویٰ ہے وہ سب اس نبی ﷺ پر ایمان کے عہد میں شامل ہیں۔

نبوت: اللہ تعالیٰ کی سنتِ جاریہ

تسلسل نبوت کی آخری آیت کے طور پر عرفان شہزاد صاحب نے سورۃ حج کی آیت 75 پر بحث کی ہے۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۷۵﴾

اللہ فرشتوں میں سے اپنے پیغامبر چنتا ہے، جس طرح انسانوں میں سے چنتا ہے۔ بیشک اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔(تدبر قرآن)

عرفان شہزاد صاحب لکھتے ہیں کہ یہ آیت اگلی آیات کی تمہید ہے جن میں بنی اسماعیل کو کارِ نبوت کی انجام دہی کیلیئے چُنا گیا ہے۔ یہ بتایا جارہا ہے کہ جیسے پہلے افراد و اقوام کو چنا جاتا رہا ہے اسی سنت اللہ کے مطابق اب بنی اسماعیل کو چنا گیا ہے۔ یعنی خدا چنتا ہے، یہ نہیں کہا گیا کہ وہ چنتا رہے گا۔ کیونکہ اس نے سورۃ احزاب میں نبوت کے سلسلے کو ہی ختم کر دیا ہے۔

ہمارا مدعا اس آیت اور اس طرز کی دوسری آیات سے یہ ہے کہ ان میں سنت اللہ کا بیان ہے۔ جس کا اعتراف عرفان شہزاد صاحب کو بھی ہے۔ سنت اللہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۃ احزاب آیت 62 میں فرمایا ہے کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا "اور تم اللہ کی سنت میں ہر گز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔" لہٰذا تسلسل نبوت کی آیات بینات اور اس ارشادِ ربانی کی روشنی میں ہم یہ موقف رکھتے ہیں کہ زیرِ بحث آیت میں اللہ تعالیٰ کی سنتِ جاریہ کا بیان ہے جو صیغہ مضارع سے بھی واضح ہے۔(فعل مضارع کے تحت آیت میں دونوں معانی آجاتے ہیں یعنی چنتا ہے/چنے گا) لیکن اس کے باوجود فاضل ناقدِ اس سنت اللہ میں استمرار سے انکاری ہیں۔ اور اس کا واحد سبب آیت خاتم النبیین کی انکی تشریح ہے جسے وہ اپنے آرٹیکل میں شروع سے آخر تک مسلسل ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ان کے اس رویے کی غلطی ہم پیچھے واضح کر آئے ہیں۔ یہ مضمون مزید سورۃ آل عمران آیت 179 اور سورۃ نحل آیت 2 وغیرہ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

تسلسل نبوت کے باب میں اگرچہ اور آیات بھی موجود ہیں لیکن ہم یہاں اس کا اختتام کرتے ہیں۔ اس باب میں مذکور آیات سے واضح ہے کہ تسلسل نبوت کا مضمون قرآن مجید میں کئی ایک مقامات پر آیا ہے۔ اور ہر وہ شخص جو پہلے سے قائم کردہ عقائد کو قرآن مجید پر تھوپنے کی بجائے درست عقائد کیلیئے اِس سے ہدایت کا خواستگار ہوتا ہے وہ ضرور اسی نتیجے پر پہنچتا ہے جو ہم نے اخذ کیا ہے۔ کتنی ہی آیات ہیں جو ہمارے موقف کی تائید میں موجود ہیں جبکہ ہمارے مخالفین کے پاس صرف ایک آیت ہے اور اس کی جو تشریح وہ پیش کرتے ہیں وہ بھی نسبتاً جدید تشریح ہے۔ جیسا کہ آگے واضح کیا جائے گا۔

باب سوم: جھوٹا مدعی الہام اور اس کا انجام

سورۃ الحاقہ میں سچے اور جھوٹے مدعی الہام میں فرق کا عالمگیر اصول بیان کیا گیا ہے جو قرآن مجید کی دیگر آیات اور حتیٰ کہ گذشتہ صحائف میں بھی پایا جاتا ہے۔ آیات ملاحظہ ہوں:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾

کہ بیشک یہ ایک باعزت رسول کالایا ہوا کلام ہے۔اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں۔ تم بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔اور یہ کسی کاہن کا بھی کلام نہیں۔ تم بہت ہی کم سمجھتے ہو! یہ خداوند عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔اور اگر یہ ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا تو ہم اس کو قوی بازو سے پکڑتے۔ پھر ہم اس کی شہ رگ ہی کاٹ دیتے۔ پس تم میں سے کوئی بھی اس سے ہم کو روکنے والا نہ بن سکتا۔(تدبر قرآن)

یہ سورۃ مبارکہ مکی ہے جیسا کہ اس کے مضمون سے بھی ظاہر ہے۔ سورۃ مبارکہ کی ابتدا سے ہی خطاب کفار مکہ کی طرف ہے جن کی طرف سے یہ اعتراض اٹھایا گیا تھا کہ نعوذ باللہ محمد ﷺ پر کوئی وحی نہیں ہوتی بلکہ یہ شاعروں اور کاہنوں جیسی باتیں بناتے ہیں اور انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ جس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تم بہت کم تدبر کرنے والے ہو کیونکہ اگر تم تعصب سے پاک ہو کر غور کرتے تو جان لیتے کہ یہ کلام شاعری یا کہانت کی صنف سے ہو ہی نہیں سکتا بلکہ یہ تو رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے۔ جس پر مزید دلیل دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر نعوذ باللہ محمد ﷺ خود ساختہ باتیں خدا کی طرف منسوب کرتے تو خدائی پکڑ میں آتے اور کوئی بھی انھیں اس سے بچا نہ سکتا۔یعنی قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کی یہ دلیل ہے کہ اس کا حامل خدائی تائیدات رکھتا ہے جبکہ جھوٹا تو خدا کی گرفت میں آتا ہے۔

قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یہ اصول حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے ایک شخص کی زبانی بھی بیان ہوا ہے، جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنا چاہا تو اس مومن نے کہا:

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲﴾

اور فرعون کی آل میں سے ایک مومن مرد نے کہا جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا کہ کیا تم محض اس لئے ایک شخص کو قتل کرو گے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا ربّ اللہ ہے اور وہ تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے کھلے کھلے نشان لے کر آیا ہے۔ اگر وہ جھوٹا نکلا تو یقیناً اُس کا جھوٹ اُسی پر پڑے گا اور اگر وہ سچا ہوا تو جن چیزوں سے وہ تمہیں ڈراتا ہے ان میں سے کچھ ضرور تمہیں آ پکڑیں گی۔ یقیناً اللہ اُسے ہدایت نہیں دیا کرتا جو حد سے بڑھا ہوا (اور) سخت جھوٹا ہو۔ (ترجمہ حضرت مرزا طاہر احمد رحمۃ اللہ علیہ)

اب ہم عرفان شہزاد صاحب کے استدلال کا تجزیہ کرتے ہیں۔ *وہ فرماتے ہیں کہ یہاں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اگر سچا نبی خدا کی طرف جھوٹ منسوب کرے تو وہ خدائی گرفت میں آتا ہے لیکن جھوٹا نبی اس پکڑ سے آزاد ہے۔*

یہ بات سمجھ لیجئے کہ ان تمام آیات میں خطاب کفار مکہ کی طرف ہے۔ ان سے بلکہ کسی سے بھی یہ بات کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا کفار مکہ کا جواب اس سے مختلف ہو گا کہ (نعوذ باللہ) جبھی تو تمھارا نبی ہلاک نہیں ہوا، اس میں اس کی صداقت کی کون سی دلیل ہے؟ اس استدلال سے گویا یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ ہر ایک مدعی نبوت جو ہلاک ہو گیا نعوذ باللہ امکان ہے کہ وہ مدعی سچا تھا لیکن خدا تعالیٰ کی طرف جھوٹ منسوب کر بیٹھا، اس لئے ہلاک کیا گیا۔ اور تمام مدعی نبوت جن کی جماعتیں بڑھیں اور سینکڑوں پیش گوئیاں ان کی پوری ہوئیں، انھیں جھوٹا ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مہلت دی تھی! سو افسوس ہے ان لوگوں پر جو ایسی باتیں کر کے مخالفین کو اسلام پر ہنسی کا موقع دیتے ہیں۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اس آیت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ دین کے ابلاغ میں آنحضرت ﷺ کی طرف سے کوئی کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی۔

مکرر عرض ہے کہ ان آیات میں خطاب رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے ہی نہیں بلکہ کفار مکہ مخاطب ہیں۔ ان کیلئے ایسی بات کرنے سے کیا حاصل؟ پھر آیات کا یہ مقصد سیاق وسباق سے بھی میل نہیں کھاتا۔

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ اگر ان آیات سے سچے نبی کا عمومی معیار بتانا مقصود ہوتا تو طرز بیان آنحضرت ﷺ کیلئے مخصوص نہ ہوتا۔ ان کی اس بات پر حیرت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ بات ان کی پچھلی بات سے متضاد ہے۔ ابھی انھوں نے فرمایا تھا کہ اس آیت سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ سچا نبی افترا کرے تو ہلاک ہوتا ہے جبکہ جھوٹا ایسا کرے تو ہلاک نہیں کیا جاتا۔ یہ اصول تب اخذ ہو گا جب اس آیت کی عمومی حیثیت کا اعتراف کیا جائے گا۔ اگر یہ

آیت آنحضرت ﷺ کیلئے مخصوص ہے تو یہ عمومی نتیجہ آپ نے کیسے نکالا؟ یقیناً اس آیت کی عمومی حیثیت کو مان کر ہی یہ نتیجہ نکالا۔ اب اگر آپ عمومی حیثیت مانتے ہیں تو یہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا جو آپ نے ابھی کیا ہے اور اگر عمومی حیثیت نہیں مانتے تو وہ نتیجہ نہیں نکلتا جو آپ بیان فرماتے ہیں۔

قطع نظر اس تضاد بیانی کے، کیا قرآن مجید میں یہ عام اسلوب نہیں پایا جاتا کہ آنحضرت ﷺ کے حوالے سے کی جانے والی بات اپنے اندر عمومی رنگ رکھتی ہے؟ مثلاً سورۃ غاشیہ میں فرمایا: فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۱﴾ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۲﴾ "تم یاددہانی کرو! تم بس ایک یاددہانی کر دینے والے ہو۔ تم ان پر داروغہ نہیں مقرر ہو۔" ان آیات میں اگرچہ خطاب آنحضرت ﷺ کی طرف ہے لیکن دراصل اس میں ہر نبی بلکہ ہر مبلغ کا ذکر ہے۔

آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ دین کی باحفاظت منتقلی کے بعد اب اس کی حفاظت کیلئے ایسے انتظام کی ضرورت نہیں کہ جھوٹا نبی ہلاک کیا جائے۔

نجانے یہ بات کہاں سے اخذ کی گئی ہے کہ ان آیات میں دین کی حفاظت زیرِ بحث ہے۔ اگر اس آیت کا سیاق و سباق دیکھئے تو بالکل متعین ہو جاتا ہے کہ بحث اس بات پر ہے کہ آیا قرآن مجید اللہ کا کلام ہے یا خود ساختہ شاعری وغیرہ۔ اسی کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔

اور نہ صرف قرآن میں جھوٹے نبی کی یہ نشانی بیان ہوئی ہے کہ وہ خدا کی پکڑ میں آتا ہے بلکہ سابقہ الٰہی کتب میں بھی کسی نبی کی صداقت کی یہی علامت لکھی ہے۔ (دیکھئے تورات، کتاب اِستثنا 18:20 اور دیکھیے انجیل، کتاب اَعمال 5:33-39)

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید سمیت کسی الہامی کتاب میں "کامیاب جھوٹے نبی" جیسا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ پس دیگر دلائل کے ساتھ یہ بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کی ایک قوی دلیل ہے۔

قتلِ انبیاء

اس حوالے سے ہمارے استدلال کا جواب فاضل ناقد نے نہیں دیا۔ بلکہ اس کا رد اس طرح کرنا چاہا ہے کہ چونکہ قرآن و بائبل میں یہودیوں کے متعلق ذکر ہے کہ انھوں نے انبیاء کو قتل کیا اس لئے یہ استدلال درست نہیں کہ جھوٹا نبی خدا کی گرفت میں آتا ہے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ قرآن مجید میں قتل انبیاء سے مراد ان کے قتل تک پہنچی ہوئی شدید مخالفت ہے جیسا کہ غامدی صاحب نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قول کی ایسی ہی تشریح کی ہے

جہاں انھوں نے اپنے متعلق فرمایا تھا کہ ضرور ہے کہ ابن آدم قتل کیا جائے (لوقا 9:22)۔ لغت بھی ہمارے ان معنوں کی تصدیق کرتی ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں لکھا ہے کہ قَتَلَہُ اللہُ یعنی اللہ نے اس پر لعنت کی اور اُقْتُلُوا فلانا یعنی فلاں سے اعراض کرو۔ لیکن اگر کوئی قتل بمعنی مارے جانے پر ہی اصرار کرے تو اس سے بھی ہمارے استدلال پر کوئی حرف نہیں آتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اگر قرآن کی نص صریح سے ثابت ہو کہ نبی قتل ہوتے رہے ہیں تو پھر ہمیں اس سے انکار نہیں۔ مگر نبی نہ تو ناکام قتل ہو سکتا ہے اور نہ اس حال میں کہ لوگ فتنہ میں پڑیں۔ (الحکم جلد 7 نمبر 15 مؤرخہ 24 اپریل 1903 صفحہ 12)

چنانچہ اگر ہم بائبل سے وہ تمام مثالیں دیکھیں جہاں انبیاء کا قتل ہونا بیان کیا گیا ہے تو پتا چلتا ہے کہ ایک نبی بھی ایسا نہیں کہ اگر اسے قتل کیا گیا تو دوسرا اس کی تصدیق کیلئے موجود نہ ہو۔ اگر اخی-اب کی بادشاہت میں انبیاء قتل ہوئے تو علاوہ دیگر کے یسعیاہ نبی ان کی تصدیق کیلئے موجود تھے اور اللہ تعالیٰ نے مختلف نشانوں سے ان کی اور دیگر انبیاء کی صداقت ثابت کر دی۔ اگر یحییٰ قتل ہوئے تو خود مسیح علیہ السلام ان کی گواہی دینے کیلئے موجود تھے۔ نہ یہ ناکام تھے اور نہ اس اقدام سے لوگ فتنے میں پڑے بلکہ اب تک لاکھوں لوگ ان کی گواہی دیتے ہیں۔

اب رہی بات انیسویں صدی کے مزعومہ مدعیان نبوت کی جنھیں معترض کے مطابق جھوٹا ہونے کے باوجود مہلت ملی تو ایسا دعویٰ کرنے سے پہلے ان پر لازم تھا کہ پہلے تو ان حضرات کی اپنی تحریر سے ان کا دعویٰ ثابت کرتے پھر دکھاتے کہ یہ وہ الہامات ہیں جن کے متعلق ان لوگوں نے منزل من اللہ ہونے دعویٰ کیا تھا۔ بلا ثبوت دعویٰ کچھ شے نہیں۔

اسی طرح ناقد صاحب بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی سرکاری ملازم اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرے تو اسے جو سزا ملے گی وہ اس سے مختلف ہوگی جو عام آدمی کو وہی جرم کرنے پر ملے گی۔ چلیں اس مثال کے ذریعے ہی سہی انھوں نے یہ تو تسلیم کیا کہ جھوٹے دعویدار کو بھی سزا دی جاتی ہے۔ اور یہاں اصل مثال یہ قائم ہوتی ہے کہ جیسے دنیاوی حکومت جھوٹے عہدیدار کو لوگوں میں اشتباہ پیدا کرنے کیلئے چھوڑ نہیں دیتی ایسے ہی دنیا کا حقیقی بادشاہ بھی اپنے جھوٹے ایلچیوں کو بغیر سزا نہیں چھوڑتا۔

باب چہارم: ایک مصلح کی نوید

قرآن وحدیث میں امام مہدی کی پیش گوئی

پچھلے ابواب میں عمومی طور پر تسلسل نبوت کی آیات پر بحث کی گئی تھی۔ اب ایک مصلح کی آمد پر مشتمل آیات پیش کی جاتی ہیں۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت سورۃ جمعہ کی آیت 3 ہے جس میں خود آنحضرت ﷺ کی بعثت ثانیہ کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲﴾

اسی نے اٹھایا ہے امیوں میں ایک رسول انہی میں سے جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ (تدبر قرآن)

اگلی آیت میں فرمایا:

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳﴾

اور انہی میں سے اُن دوسروں میں بھی جو ابھی اِن میں شامل نہیں اور اللہ غالب و حکیم ہے۔ (تدبر قرآن)

یعنی: "آنحضرت ﷺ کو دوسروں میں بھی مبعوث کیا ہے جو اُمیوں میں سے ہیں لیکن ابھی اُمیوں میں شامل نہیں ہوئے۔" (منہم اور بہم دونوں میں ضمیر اُمّیّٖن کی طرف ہے)

امین احسن اصلاحی صاحب فرماتے ہیں:

"اوپر (آیت 2 میں) اگرچہ لفظ 'اُمّیّٖن' عام استعمال ہوا ہے لیکن اس سے مراد صرف وہ بنی اسمٰعیل ہیں جو مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ چنانچہ آیت کا ٹکڑا 'وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ' اس پر دلیل بھی ہے۔" (تدبر قرآن)

اب آیت مبارکہ کی تشریح یہ ہوگی: "آنحضرت ﷺ کو دوسروں میں بھی مبعوث کیا ہے جو صحابہ میں سے ہیں لیکن ابھی صحابہ میں شامل نہیں ہوئے۔"

بعد میں آنے والے اِن لوگوں کو صحابہ میں شامل کیا گیا ہے اور پھر صرف یہی نہیں بلکہ وعطف سے یہ بھی واضح کر دیا کہ آنحضرت ﷺ ان صحابہ پر بھی خدا کی آیات تلاوت کریں گے، انہیں بھی پاک کریں گے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیں گے اور وہ لوگ بھی اس سے پہلے گمراہی میں پڑے ہوں گے۔

چنانچہ اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جب امت تزکیہ نفس سے محروم اور کتاب وحکمت کی تعلیم بھلادے گی اور دوبارہ کھلی کھلی گمراہی میں پڑ جائے گی تو خدا تعالیٰ آنحضرت ﷺ کو دوبارہ مبعوث فرمائے گا اور ایک ایسی جماعت تیار ہو گی جو صحابہ کے نمونے دکھائے گی۔ اب ظاہر ہے کہ خود رسالت مآب ﷺ کا دوبارہ دنیا میں آنا تو محال ہے لہٰذا اس سے آپ ﷺ کے بروز یعنی کامل متبع کا آنا ہی مراد ہو سکتا ہے جسے بوجہ کامل مشابہت مجازی طور پر آپ ﷺ کا نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ نے اِس آیت مبارکہ کی یہی تشریح فرمائی ہے:

بخاری میں آتا ہے کہ جب سورۃ جمعہ کی یہ آیات نازل ہوئیں تو کسی صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ آخرین (دوسرے جن میں آنحضرت ﷺ کو مبعوث کیا گیا ہے) کون ہیں؟ آپ ﷺ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: لَوْ كَانَ الْإِيمَانُ عِنْدَ الثُّرَيَّا لَنَالَهُ رَجُلٌ مِنْ هٰؤُلَاءِ یعنی کسی زمانے میں اگر ایمان دنیا سے غائب ہو کر ثریا ستارے پر بھی چلا گیا تب بھی ان فارسی لوگوں میں سے ایک شخص اسے دوبارہ زمین پر اتار لائے گا۔ (بخاری، 4897)

احادیث میں مہدی و مسیح کی یہی علامات بیان ہوئی ہیں۔ اس آنے والے کو کوئی بھی نام دیجئے، بہر حال ایک مصلح کے آنے کی پیش گوئی ان آیات میں موجود ہے۔

اب اہل المورد کے موقف کا جائزہ لیتے ہیں۔ امین احسن اصلاحی صاحب اُمِّيّنَ سے درست طور پر صحابہ مراد لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود آیت مبارکہ کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ کو دوسروں میں بھی مبعوث کیا ہے جو عربوں (اُمِّيّنَ) میں سے ہیں لیکن ابھی صحابہ (اُمِّيّنَ) میں شامل نہیں ہوئے۔ یعنی اس آیت میں "دوسروں" سے مراد وہ عرب ہیں جو ابھی ایمان لا کر صحابہ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔

اس پر عرض ہے کہ جب بقول آپ کے، اُمِّيّنَ سے صرف صحابہ مراد ہیں تو اپنے موقف کی تائید کیلئے ایک ہی آیت میں ایک مرتبہ اس سے غیر صحابہ مراد لینا اور دوسری مرتبہ صحابہ مراد لینا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ یا تو دونوں دفعہ تمام عرب مراد ہوں گے یا دونوں مرتبہ صرف صحابہ۔ یہ سقم ہے جو اصلاحی و غامدی صاحب کی تفاسیر میں پایا جاتا ہے۔

اس لئے ایک ہی مفہوم اس آیت سے اخذ ہوتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے۔

بعض اعتراضات کا رد

ناقد صاحب نے بیان کیا ہے کہ یہاں "بعث" فعل ماضی آیا ہے، اس لئے اس سے مستقبل کی کوئی پیشگوئی بر آمد نہیں کی جاسکتی۔

اول، قرآن مجید میں ہی فعل ماضی مستقبل کیلئے بھی استعمال ہوا ہے (النمل: 87)۔ دوم، یہاں اس کا قرینہ بھی پایا جاتا ہے کیونکہ آیت مبارکہ کے مطابق "آخرین" ابھی صحابہ سے نہیں ملے بلکہ مستقبل میں ملیں گے۔ سوم، یہاں "امیین" کا مطلب صحابہ متعین ہو جانے سے ہمارا مدعا بتمام و کمال ثابت ہو جاتا ہے۔ الفاظ یوں ہیں: "آنحضرت ﷺ کو دوسروں میں بھی مبعوث کرے گا/ کیا ہے جو صحابہ میں سے ہیں لیکن ابھی صحابہ سے نہیں ملے"۔ (ہم نے یہاں دونوں تراجم نقل کر دئے ہیں کیونکہ اگر کوئی زیادہ ہی اصرار کرے تب بھی واضح ہے کہ آیت کا مفہوم مستقبل کے معنی آپ سے آپ پیدا کر رہا ہے۔) دوسری طرف، اگر یہاں امیین سے تمام عرب مراد لئے جائیں جیسا کہ عرفان صاحب کو اصرار ہے تو آیت کا مفہوم ہی مہمل ہو جاتا ہے۔ اس بات کا بھلا کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ "وہ عربوں میں سے ہیں لیکن ابھی عربوں سے نہیں ملے"۔ چہارم، بخاری کی حدیث بھی ہمارے بیان کردہ معنوں کی تائید کر رہی ہے۔

ضمناً عرض کرتا چلوں کہ جب انھوں نے یہ اعتراض کیا تو مجھے ایک مسیحی کی بات یاد آگئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آخری خطاب میں جو بات کہی تھی (خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا اور کوہ فاران پر جلوہ گر ہوا اور دس ہزار قدسیوں میں سے آیا۔ استثناء 33:2) وہ فعل ماضی میں ہے اس لئے آنحضرت ﷺ کے متعلق پیشگوئی نہیں ہو سکتی۔ اسے بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ ایسا ہی اعتراض یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق پیشگوئیاں پر کرتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا فارسی الاصل ہونا

اب رہی بات فارسی الاصل ہونے کی تو پہلی بات تو یہ یاد رکھنی چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھنا، دو معانی رکھتا ہے، کہ یا تو آنے والا عمومی طور پر عجمی ہوگا یا خصوصی طور پر فارسی۔ حضورؑ کے حوالے سے یہ دونوں باتیں ثابت ہیں۔ عجمی ہونا تو مترشح ہے جبکہ فارسی ہونا ہم بیان کئے دیتے ہیں۔ آپ علیہ السلام کے آبائی کاغذات سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ سمرقند سے آئے تھے اور تاریخ سے ہم جانتے ہیں کہ سمرقند ایرانی سلطنت کا ہی حصہ تھا۔ اور اس زمانے میں شمال مشرق سے آنے والی ہر قوم مغل کہلاتی تھی (میڈیئیول انڈیا انڈر محمڈن رول، مصنفہ سٹینلے لین پول

صفحہ 197)۔اسی طرح فارسی ہونے کا جو الہام حضور علیہ السلام کو ہوا وہ براہین احمدیہ میں درج ہے یعنی دعوے سے بہت پہلے کا ہے اس لئے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ دعوے کے بعد بنالیا۔

پیش گوئی: آنحضرت ﷺ کا ایک گواہ آیگا

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰى اِمَامًا وَّرَحْمَةً اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ

﴿ھود:۱۸﴾

(ترجمہ و تفسیر از تفسیر کبیر)

"پس کیا جو (شخص) اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر (قائم) ہے اور (اس کی صداقت کا) ایک گواہ اُس (یعنی خدا تعالیٰ) کی طرف سے (آکر) اس کی پیروی کرے گا اور اس سے پہلے موسی کی کتاب تھی جو (لوگوں کیلئے) امام اور رحمت تھی (ایک جھوٹے مدعی جیسا ہو سکتا ہے؟) وہ (یعنی موسی کے سچے پیرو) اس پر (بھی ضرور) ایمان لاتے ہیں اور ان (مخالف) گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے گا تو (دوزخ کی) آگ اس کے (لئے) وعدے کی جگہ ہے۔ پس (اے مخاطب) تو اس کے متعلق کسی (قسم کے) شک میں نہ پڑ۔ وہ یقیناً بالکل حق ہے۔ (اور) تیرے رب کی طرف سے ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لایا کرتے۔"

"قرآن شریف اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی پرکھنے کے لئے تین گر بتائے گئے ہیں۔ اور فرمایا ہے کہ جس میں یہ تین باتیں پائی جائیں وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔۔۔

دنیا میں اس سچائی سے تعلق رکھنے والے تین قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں۔

(۱) ایک وہ جو اس وقت اس کے مخاطب ہوں۔

(۲) وہ جو اس وقت تو مخاطب نہ ہوں لیکن آئندہ مخاطب بننے والے ہوں۔

(۳) تیسرے وہ لوگ جو پچھلے زمانہ میں گذر چکے ہوں۔ لیکن وہ اس آنے والے تغیر کی امید رکھتے تھے۔

اگر ان تینوں قسم کے گواہوں سے کسی امر کی سچائی ثابت ہو تو اس سچائی میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تینوں کے تینوں زمانے اس کے حق میں گواہی دیتے ہیں۔۔۔

چنانچہ سب سے پہلے فرماتا ہے کہ قرآن کریم یا اس کا لانے والا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کی طرف سے اپنے ساتھ ایسے دلائل رکھتا ہے جو قطعی طور پر ثابت کرتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور چونکہ قرآن کریم کا زمانہ ممتد ہونے والا تھا اور اس نے بعید ترین زمانہ کے لوگوں کو بھی ہدایت دینی تھی اس لئے فرمایا کہ ویتلوہ شاہد منہ۔ اس کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے جب اتنا عرصہ گذر جائے گا کہ پہلے دلائل قصوں کے رنگ میں رہ جائیں گے تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک نیا گواہ آجائے گا۔ پھر فرمایا کہ علاوہ ان موجودہ دلائل کے گذشتہ نبیوں نے بھی اس کی خبر دی ہوئی ہے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے کہ وہ امام ہے یعنی لوگوں کو کھینچ کھینچ کر ادھر لاتی ہے اور رحمت ہے کہ قرآن کے ماننے کے لئے اس نے لوگوں کے واسطے آسانیاں کر دی ہیں اولئک یؤمنون بہ یعنی جن لوگوں کے لئے موسیٰ کی کتاب امام اور رحمت بن جاتی ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔۔۔

شاہد منہ کے متعلق مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔۔۔ بعض نے شاہد منہ کے معنی ابو بکر کے اور بعض نے حضرت علی کے کئے ہیں مگر یہ بھی درست نہیں کیونکہ آیت میں شاھد کے لئے منہ کی شرط لگائی گئی ہے۔ یعنی وہ شاہد خدا تعالیٰ کی طرف سے اس شہادت کے لئے حکم پا کر کھڑا ہو گا۔ اور حضرت ابو بکر اور حضرت علی کی طرف سے ہرگز یہ دعویٰ نہ تھا کہ ان کو خدا تعالیٰ نے شہادت کے لئے مبعوث کیا ہے۔ بعض لوگوں نے عبداللہ بن سلام کو شاہد قرار دیا ہے۔ لیکن ان پر بھی یہی اعتراض پڑتا ہے۔

پس جاننا چاہئے کہ اس جگہ خصوصیت کے ساتھ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہی ذکر ہے جن کا نزول خدا تعالیٰ کی طرف سے اسی رنگ میں ہونا تھا جیسے کہ پہلے بینہ کا نزول ہوا تھا۔ اور جن کی آمد کی غرض یہ تھی کہ وہ اسلام کی صداقت کی شہادت تازہ نشانوں سے دیں جبکہ اسلام کی صداقت اور اس کی قوت قدسیہ کے خلاف بہت سے امور جمع ہونے والے تھے۔۔۔"

اہل المورد کے ہاں اس آیت کی یہ تفسیر کی جاتی ہے:

سو کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے ایک برہان پر ہے، پھر (اُس کی تائید میں) اُس کے بعد ایک گواہ بھی اُس کے پروردگار کی طرف سے آجاتا ہے اور اُس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی رہنما اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی موجود ہے، (اِس قرآن کا انکار کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں)۔ اِس طرح کے لوگ تو

اِس پر ایمان ہی لائیں گے۔ اور (تمھارے مخاطبین کے) اِن گروہوں میں جو شخص بھی اِس کا منکر ہو گا، اُس کے لیے وعدے کی جگہ دوزخ ہے۔ اِس لیے، (اے پیغمبر) تم اِس کے بارے میں کسی شک میں نہ پڑو۔ یہ حق ہے تمھارے پروردگار کی طرف سے، مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔ (البیان)

یعنی قرآن مجید کو وہ شخص قبول کرتا ہے جو اپنے پروردگار کی طرف سے برہان یعنی حق و باطل میں تمیز کا نور رکھتا ہو۔ پھر اس نورِ فطرت کی تائید میں ایک گواہ یعنی وحی الٰہی بھی آجاتی ہے۔ پھر کتابِ موسیٰ بھی ایسی وحی کی تائید میں پہلے سے موجود ہے۔ اس کے مقابل وہ جن کا نورِ فطرت بجھ جاتا ہے ایسے دنیا پرست ہی قرآن مجید کو قبول نہیں کرتے۔

یہ تفسیر سیاق و سباق سے مطابقت نہیں رکھتی جو ہم واضح کئے دیتے ہیں۔ یہ سورۃ ہود کی آیت 17 ہے۔ اس سے پہلے آیت 13 میں کفار مکہ کا یہ اعتراض نقل کیا گیا ہے کہ نعوذ باللہ محمد ﷺ نے خدا پر افترا کیا ہے۔ اس کے جواب میں درج ذیل دلائل دیے ہیں:

(۱) فرمایا کہ اگر سچے ہو تو تم بھی ایسی دس سورتیں گھڑ لاؤ اور اپنے مددگار بھی بلا لو۔ اور اگر ایسا نہ کر سکے تو کیا پھر صداقت کو قبول کر لو گے؟ اصل میں تو تم دنیا پرست ہو سو خدا پرستی تمھارے لئے مشکل ہے۔

(۲) فرمایا جسے تم مفتری کہتے ہو وہ تو تینوں زمانوں میں اپنی صداقت پر دلائل رکھتا ہے۔

آیت 13 میں افترا کے اعتراض پر جو بات شروع ہوئی تھی اسے سمیٹتے ہوئے آیت 18 میں فرمایا کہ مفتری تو ظالم ہوتا ہے اور اس پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔ یعنی صادقوں کی حالتیں اور ہوتی ہیں اور کاذبوں کی اور۔ سو غور کرو کیسے اعتراض کر رہے ہو!

آیت 13 اور 18 کے اس ربط کو ملحوظ رکھئے تو بالکل طے ہو جاتا ہے کہ ان آیات میں افترا کے اعتراض پر آنحضرت ﷺ کی صداقت کے دلائل دئے گئے ہیں۔ اس سیاق و سباق میں محذوف یہ بنتا ہے کہ کیا وہ شخص مفتری ہو سکتا ہے جو ایسے دلائل رکھتا ہے، نہ کہ وہ محذوف جو غامدی صاحب نے بیان کیا ہے (یعنی: کیا وہ شخص قرآن کا انکار کر سکتا ہے جو ایسے دلائل رکھتا ہے)۔ پھر آیت کے الفاظ پر بھی غور کیجئے، اگر یہاں آنحضرت ﷺ کی صداقت زیر بحث نہ ہوتی تو خصوصاً کتاب موسیٰ کا ذکر کیوں کیا جاتا؟ کتاب موسیٰ حضور ﷺ کی گواہی دیتی ہے اور ان پر ایمان لانے کیلئے لوگوں کی رہنمائی کرنے والی کتاب ہے۔ غرض، ان آیات میں آنحضرت ﷺ کے گواہ کا آنا مذکور ہے، خود آپ ﷺ یا آپکی وحی کو گواہ نہیں ٹھہرایا گیا ہے۔

لیکن چونکہ اصلاحی و غامدی صاحب نے آیات کے اس ربط کو نہیں سمجھا، اس لئے آیتِ مذکورہ کا پچھلی آیات سے ایک مصنوعی ربط قائم کیا ہے اور وسیع تر نظم کلام کو نظر انداز کیا ہے۔ نیز، محذوف متعین کرنے میں بھی غلطی کھائی ہے۔

مسیح موعود کے زمانے کی علامات (حصہ اول)

اب ہم ان آیات کا ذکر کریں گے جن میں مسیح موعود کے زمانے کی علامات بیان ہوئی ہیں اور ان کے ظہور کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ تفصیلات میں جانے سے قبل چار باتیں اصولی طور پر سمجھ لیجیے:

(۱) بعض مقامات پر ان پیش گوئیوں کے ساتھ قیامت کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ کیونکہ عام محاورہ قرآن مجید کا ہے کہ دنیا کے ایک واقعے کے ساتھ آخرت کا واقعہ پیوند کیا جاتا ہے لیکن معمولی تدبر سے واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں حصے ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ نمونے کے طور ہم سورۃ قمر کے دو مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں جس سے یہ اصول قطعیت سے ثابت ہو جاتا ہے۔

پہلے سورۃ قمر کی آیات 48-44 ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں فرمایا ہے کہ کفار کی کثیر جماعت انھیں کچھ فائدہ نہ دے گی اور عنقریب یہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ اور پھر اس بیان کے ساتھ دوزخ کا ذکر بھی ملا دیا ہے۔

دوم، سورۃ قمر کی ابتدائی آیات دیکھیں۔ فرمایا کہ قیامت قریب آگئی اور چاند شق ہو گیا۔ قیامت کے ذکر سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ شق القمر کا معجزہ ظہور میں نہیں آیا بلکہ قیامت کو ہو گا۔ حالانکہ بعد کی آیات بالکل واضح کر دیتی ہے کہ یہ آیات شق القمر کے واقعے کے بعد نازل ہوئی ہیں کیونکہ فرمایا کہ جب کافر کوئی نشان دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے۔ آگے فرمایا کہ انھوں نے پہلے لوگوں سے بھی سبق نہیں سیکھا بلکہ انہی کی طرح نشان دیکھنے کے بعد بھی انکار ہی کیا ہے۔ یہاں بھی دنیا کے واقعے کے ساتھ قیامت کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۲) اسی طرح بعض آیات میں صرف آخری زمانے کی علامات ہی مذکور ہوتی ہیں اور ان میں قیامت کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ لیکن قلت تدبر کی وجہ سے انھیں قیامت پر محمول کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ تکویر جس کی تفصیل آگے بیان کی جاتی ہے۔

(۳) جب یہ ثابت ہو جائے کہ ان آیات میں قیامت کی نہیں بلکہ مستقبل کے واقعات کی پیش گوئی ہے تو ان میں تشبیہ اور استعارے کا موجود ہونا ایک بدیہی بات ہے۔ کیونکہ خود غامدی صاحب کو اعتراف ہے کہ اگر کوئی شخص مستقبل کی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کی خبر دے تو تشبیہات اور استعاروں میں ہی کلام کرے گا۔ وہ فرماتے ہیں:

"آج سے دو صدی پہلے ہم میں سے کوئی شخص اگر مستقبل کا علم پا کر بجلی کے قمقموں کا ذکر کرتا تو غالباً اسی طرح کرتا کہ دنیا میں ایسے چراغ جلیں گے جن میں نہ تیل ڈالا جائے گا اور نہ اُنھیں آگ دکھانے کی ضرورت ہو گی۔" (میزان، صفحہ 34)

(٤) بہت سی پیش گوئیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جب تک ان کا مصداق ظہور میں نہ آئے، کوئی حتمی بات ان کے متعلق کہی نہیں جاسکتی۔ لیکن جب وہ ظاہر ہو جاتاہے تو کوئی اور تفسیر ممکن نہیں رہتی۔ مثلاً وہ سب آیات جن میں سائنسی ایجادات اور دریافتوں کا بیان ہوناذکر کیا جاتاہے، ان کا اصل مصداق ان دریافتوں کے بعد ہی معلوم ہوا ہے۔ غامدی صاحب آنحضرت ﷺ کی ایک پیش گوئی کی وضاحت اس طرح سے کرتے ہیں:

"ایک نشانی یہ ہے کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جن دے گی اور دوسری یہ ہے کہ تم (عرب کے) اِن ننگے پاؤں، ننگے بدن پھرنے والے کنگال چرواہوں کو بڑی بڑی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے دیکھوگے۔" (صحیح مسلم، 93)

اِن میں سے دوسری علامت تو بالکل واضح ہے۔ پچھلی صدی سے اِس کا ظہور سرزمین عرب میں ہر شخص بہ چشم سر دیکھ سکتا ہے۔ پہلی علامت کا مصداق متعین کرنے میں لوگوں کو دقت ہوئی ہے۔ ہمارے نزدیک اُس کا مفہوم بھی بالکل واضح ہے۔ اُس سے مراد ایک ادارے کی حیثیت سے غلامی کا خاتمہ ہے۔ یہ دونوں واقعات ایک ہی زمانے میں ہوئے ہیں۔ اِس لحاظ سے یہ پیشین گوئی قربِ قیامت کا زمانہ بالکل متعین کر دیتی ہے۔ (میزان، صفحہ 176)

کیا اس پیشگوئی کے پورا ہونے سے پہلے اس کے مصداق کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہا جاسکتا تھا؟ یقیناً نہیں۔ اس لئے پیش گوئیوں کے معاملے میں بہت احتیاط اور تقویٰ کی ضرورت ہوتی ہے۔ انبیاء کے مخالفین اسی راہ سے ٹھوکر کھاتے ہیں۔

ان اصولوں کے بعد اب ہم مسیح موعود کے زمانے کی پیش گوئیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ سب سے پہلے سورۃ تکویر کی پہلی چودہ آیات ملاحظہ فرمائیں:

"جب سورج لپیٹ دیا جائے گا۔ اور جب ستارے ماند پڑ جائیں گے۔ اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔ اور جب دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں بغیر کسی نگرانی کے چھوڑ دی جائیں گی۔ اور جب وحشی اکٹھے کئے جائیں گے۔ اور جب سمندر پھاڑے جائیں گے۔ اور جب نفوس ملادئے جائیں گے۔ اور جب زندہ درگور کی جانے والی (اپنے بارہ میں) پوچھی جائے گی۔ (کہ) آخر کس گناہ کی پاداش میں قتل کی گئی ہے؟ اور جب صحیفے نشر کئے جائیں گے۔ اور جب آسمان کی کھال ادھیڑ دی جائے گی۔ اور جب جہنم بھڑکائی جائے گی۔ اور جب جنت قریب کر دی جائے گی۔ ہر جان معلوم کرلے گی جو وہ لائی ہے۔"

اہل المورد کے ہاں ان آیات کو قیامت پر محمول کیا جاتاہے۔ لیکن اس تفسیر میں بہت سے سقم ہیں۔ جب ایک طرف کسی قسم کی آسمانی روشنی باقی نہ رہے اور دوسری طرف زمین کا یہ حال ہو کہ شدید زلزلے کے باعث پہاڑ تک ریزہ ریزہ ہو رہے ہوں اور سونامی ہر طرف چھائی ہو، ایسے حالات میں تو تمام جاندار پلک جھپکتے ہلاک ہو جائیں گے قبل اس کے کہ انھیں معلوم ہو کہ کیا رونما ہوا ہے۔ ایسے میں اونٹنیوں کا چھوٹے پھرنا یا وحشی جانوروں کا جائے پناہ ڈھونڈتے پھرنا، ممکن ہی نہیں۔ اور اگر ہم بالفرض مان بھی لیں کہ جانداروں کو کچھ وقت زندہ رہنے کا مل جائے گا تو بھی اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں دکھائی کیسے دے گا کہ وہ جائے پناہ ڈھونڈے؟

ان کی تفسیر میں اس کے بعد کے واقعات کو میدان محشر کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ زندہ در گور کی جانے والی سے پوچھا جائے گا، حالانکہ قرآن مجید نے ایک سے زائد مقامات پر بالکل واضح فرمادیا ہے کہ اُس دن سوال صرف مجرم سے کیا جائے گا غیر مجرم سے نہیں۔ اگر کہو کہ عیسٰی علیہ السلام سے بھی تو انھیں الہ بنا لینے کے بابت سوال ہو گا۔اس کا جواب یہ ہے کہ ان سے سوال تو نصاریٰ کے اس دعویٰ کی وجہ سے ہو گا کہ ہمیں خود مسیح نے اپنی الوہیت کی تعلیم دی ہے۔ لیکن یہاں تو ایسا کوئی معاملہ نہیں۔

اس کے علاوہ اگلی آیت میں آسمان کا ذکر ہونا بھی واضح کر دیتا ہے کہ اِسی دنیا کی ہی بات کی جا رہی ہے۔ اور اُسی بات کا تسلسل ہے جو شروع کی گئی تھی۔ لہذا بالکل طے ہے کہ ان آیات میں قیامت کا ذکر ہی نہیں۔ پھر یہ کس زمانے کی پیش گوئی کی جارہی ہے ؟

اب ہم ان آیات کی درست تفسیر پیش کرتے ہیں:

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا، سیاق وسباق اجازت نہیں دیتا کہ اسے حقیقی معنوں میں لیا جائے جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں۔ بلکہ یہ وہی سورج ہے جس کے متعلق آنخضرت ﷺ نے فرمایا کہ سورج مغرب سے طلوع ہو گا یعنی اسلام کا سورج۔ یہ وہ دور ہے جب اسلام یا خود آنخضرت ﷺ کی روشنی پر پردہ ڈال دیا جائے گا۔ ایک طرف خود اس کے نام لیوا اس نور کو دھندلائیں گے تو دوسری طرف مخالفین کی سر گرمیاں بھی عروج پر ہوں گی۔

اور جب ستارے ماند پڑ جائیں گے یعنی علماء اسلام بھی اسلام کیلئے ننگ وعار ہوں گے، گویا ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو گا۔ مامور من اللہ ایسے دور میں ہی مبعوث ہوا کرتے ہیں۔

اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے، یہاں کسی زلزلے کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے مراد بڑی بڑی سلطنتوں کا اُکھڑنا ہے کیونکہ جبل سردار کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ یا اس سے مراد دیو ہیکل مشینوں کا ایجاد ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ آگے جدید سواریوں کا ہی ذکر ہے۔ چنانچہ مسیح موعودؑ کے دور میں یورپی اقوام یعنی یاجوج ماجوج کے خروج کی وجہ سے بڑی بڑی سلطنتیں پامال ہوئیں۔

اور جب دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں بغیر کسی نگرانی کے چھوڑ دی جائیں گی یعنی جانوروں کی سواری ترک کر دی جائے گی۔ مسیح موعودؑ کے دور میں خصوصاً ریل اور دیگر آمد ورفت کی ایجادات سے یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔

اور جب صحیفے نشر کئے جائیں گے یعنی کثرت سے کتب ورسائل کی اشاعت کے سامان میسر ہوں گے۔ یہ واقعہ بھی مسیح موعودؑ کے دور کا ہے۔

اور جب آسمان کی کھال ادھیڑ دی جائے گی یعنی بری و بحری ہی نہیں بلکہ آسمانی رازوں سے بھی پردہ اٹھایا جائے گا۔ چنانچہ ہوائی جہاز بھی مسیح موعودؑ کے زمانے کی ایجاد ہے۔

اور جب جہنم بھڑکائی جائے گی۔ سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ یہاں بھی دنیا کا ہی ذکر ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان ایجادات و آسائشوں کے بیان سے شاید کسی کے ذہن میں آئے کہ وہ دور تو جنت نظیر ہوگا۔ فرمایا کہ نہیں بلکہ انھیں ایجادات کے ذریعے عالمی جنگوں کی جہنم بھڑکا دی جائے گی۔ اور جہنم کی راہیں آسان ہو جائیں گی۔

اور جب جنت قریب کر دی جائے گی یعنی صرف تباہی کے سامان نہیں ہوں گے بلکہ آسائشیں بھی عام ہوں گی اور خدا کے مامور کی موجودگی میں جنت کا حصول آسان ہو جائے گا۔

ہر جان معلوم کر لے گی جو وہ لائی ہوگی یعنی اعمال کے نتائج وسیع پیمانے پر ظاہر ہوں گے۔ مسیح موعودؑ کے دور سے دنیا اس کا مشاہدہ کر رہی ہے۔

اس کے بعد کی آیات میں کفر کی رات رخصت ہونے اور اسلام کی صبح طلوع ہونے کا واضح ذکر موجود ہے۔ جو مسیح موعودؑ کے ساتھ مقدر ہے۔

یہ سب کے سب واقعات حضرت اقدس مسیح موعودؑ کے زمانے کے ہیں۔ اسی طرح یہ ظاہر ہوئے ہیں اور ایسے واضح ہیں کہ ان کی کوئی اور تفسیر ہو نہیں سکتی۔ آگے انہی علامات کو جاری رکھتے ہوئے امام مہدی و مسیح موعود کی آمد کی پیش گوئی نقل کی جائے گی۔

مسیح موعود کے زمانے کی علامات (حصہ دوم)

سورۃ مرسلات میں فرمایا ہے:

"قسم ہے پے بہ پے بھیجی جانے والیوں کی۔ پھر بہت تیز رفتار ہو جانے والیوں کی۔ اور (پیغام کو) اچھی طرح نشر کرنے والیوں کی۔ پھر واضح فرق کرنے والیوں کی۔ پھر انتباہ کرتے ہوئے (صحیفے) پھینکنے والیوں کی۔ حجت یا تنبیہ کے طور پر۔ یقیناً جس سے تم ڈرائے جا رہے ہو لازماً ہو کر رہنے والا ہے۔ پس جب ستارے ماند پڑ جائیں گے۔ اور جب آسمان میں (طرح طرح کے) سوراخ کر دیئے جائیں گے۔ اور جب پہاڑ جڑوں سے اکھیڑ دیئے جائیں گے۔ اور جب رسول مقررہ وقت پر لائے جائیں گے۔ کس دن کے لئے اُن کا وقت مقرر تھا؟ ایک فیصلہ کن دن کے لئے۔ اور تجھے کیا سمجھائے کہ فیصلہ کن دن کیا ہے؟ ہلاکت ہے اُس دِن جھٹلانے والوں پر۔ کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر ہم بعد میں آنے والوں کو اُن کے پیچھے لاتے ہیں۔ اسی طرح ہم مجرموں سے سلوک کیا کرتے ہیں۔۔۔ ہلاکت ہے اُس دِن جھٹلانے والوں پر۔ اس کی سمت چلو جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ ایسے سائے کی طرف چلو جو

تین شاخوں والا ہے۔ نہ تسکین بخش ہے نہ آگ کی لپٹوں سے بچاتا ہے۔ یقیناً وہ ایک قلعہ کی طرح کا شعلہ پھینکتا ہے۔ گویا وہ جو گیا رنگ کے اُونٹوں کی طرح ہے۔ ہلاکت ہے اُس دِن جھٹلانے والوں پر۔"

یہ آیات بھی سورۃ تکویر میں بیان کردہ علامات کا تسلسل ہیں۔ ابتدائی آیات میں تشبیہ اور استعارے کی زبان میں کلام کیا گیا ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں۔ فرمایا:

"قسم ہے پے بہ پے بھیجی جانے والیوں کی۔ پھر بہت تیز رفتار ہو جانے والیوں کی۔" یعنی یہاں جن چیزوں کا بیان مقصود ہے وہ پہلے آہستہ اور پے در پے چلتی ہیں اور پھر بہت تیز رفتار ہو جاتی ہیں۔

"اور اچھی طرح (پیغام کو) نشر کرنے والیوں کی۔ پھر واضح فرق کرنے والیوں کی۔ پھر انتباہ کرتے ہوئے (صحیفے) پھینکنے والیوں کی۔ حجت یا تنبیہ کے طور پر۔" یعنی پھر یہ واضح فرق کرتے ہوئے پیغامات بھی نشر کرتی ہیں اور وارننگ جاری کرتے ہوئے صحیفے بھی پھینکتی ہیں تاکہ حجت تمام کریں یا متنبہ کردیں۔

غور کریں کیا جنگی طیاروں کا اس سے بہتر نقشہ کھینچا جا سکتا ہے؟ کیا عالمی جنگیں اسی منظر کی عکاسی نہیں کرتیں؟ چنانچہ پہلے طیارے آہستہ اور ایک دوسرے کے پیچھے روانہ ہوتے اور پھر بہت رفتار پکڑ لیتے۔ جنگ سے قبل مختلف علاقوں میں امتیاز کرتے ہوئے پمفلٹ پھینکے جاتے تھے تاکہ وارننگ جاری کر کے اتمام حجت کر دی جائے۔

"جس بات کا وعدہ تم سے کیا گیا ہے وہ لازماً ہو کر رہنے والی ہے۔" وعدہ کیا ہے اور کب پورا ہوگا؟ فرمایا جب ستارے ماند پڑ جائیں گے اور آسمان میں شگاف ہو جائیں گے اور پہاڑ جڑوں سے اکھیڑ دئے جائیں گے تب یہ وعدہ پورا ہوگا۔ یہ سب وہی علامات ہیں جن کی تفصیل پیچھے بیان ہوئی تھی اور ان کا مجازی ہونا بھی ثابت کیا گیا تھا۔

جیسا کہ بیان ہوا تھا، ستارے ماند پڑنے سے مراد علماء ربانی کا ختم ہونا ہے۔ آسمان پھٹنے کا محاورہ ہماری طرح عربوں میں بھی مصائب وارد ہونے کیلئے استعمال ہوتا تھا۔ پہاڑ اکھڑنے سے مراد حقیقی طور پر پہاڑوں کی توڑ پھوڑ بھی ہے جیسا کہ اس زمانے میں ہو رہا ہے اور مجازی طور پر بڑی بڑی سلطنتوں کا زوال بھی مراد ہے۔

اگلی آیت بہت اہم ہے کیونکہ وہ ان تمام علامات کا منتہا بیان کرتی ہے۔ فرمایا "اور جب رسول مقررہ وقت پر لائے جائیں گے۔ کس دن کیلئے ان کا وقت مقرر تھا، ایک فیصلہ کن دن کیلئے۔" یعنی جب تم یہ سب علامات پوری ہوتے دیکھو تو سمجھ لو کہ رسولوں کی آمد کا زمانہ آگیا تا خدا مومنین اور منکرین میں فیصلہ فرمادے۔ یہ امام مہدی/مسیح کے آنے کی خبر ہے۔ کیونکہ:

اول، سیاق وسباق اس واقعہ کو آخرت کی جانب منسوب کرنے میں مانع ہے۔ کیونکہ اس آیت سے قبل جدید زمانے کی ایجادات کا ذکر فرمایا ہے اور پھر اسی زمانے میں اسلام کے زوال کا ذکر بھی فرمادیا۔ نیز، اس آیت کے بعد فرمایا کہ جیسے پہلی قومیں خدائی طبیب کو جھٹلانے کے سبب مرض الموت کا شکار ہوئیں ویسے ہی آئندہ بھی منکرین اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالتے رہیں گے۔ یہ وہی سنت اللہ ہے جس کے متعلق سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا، وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ یعنی جب تک رسول مبعوث نہ ہو، قوم پر عذاب نہیں آیا کرتا۔ یہ قانون بھی دنیا سے متعلق ہے، آخرت سے نہیں۔ لہٰذا اگر ان آیات میں رسولوں کا دنیا کی بجائے میدان محشر میں آنا مراد ہوتا تو اس کے فوراً بعد دنیاوی قانون کے بیان کا کیا موقع تھا؟ صاف ظاہر ہے کہ یہاں دنیاوی بعثت ہی مراد ہے۔

دوم، یہ بھی یاد رہے کہ رسول ہمیشہ دنیا میں ہی مبعوث کئے جاتے ہیں جبکہ آخرت تو حساب کا دن ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہاں رسل جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے پھر ایک رسول کا آنا کیسے مراد ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ رسل کا لفظ واحد پر بھی اطلاق پاتا ہے۔ دیکھیں: سورۃ ہود آیت 59 اور سورۃ فرقان آیت 37۔ سورۃ ہود میں فرمایا، "اور یہ قوم عاد ہے۔ انھوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی۔" اس پر غامدی صاحب فرماتے ہیں: "اُن کی طرف اگرچہ ایک ہی رسول کی بعثت ہوئی تھی، مگر کوئی رسول بھی یہ دعوت اُن کے سامنے پیش کرتا، اُس کے ساتھ وہ یہی کرتے، اِس لیے ایک رسول کی نافرمانی کو تمام رسولوں کی نافرمانی قرار دیا ہے۔"

ایسی ہی غرض یہاں ہے کیونکہ دنیا کے بیشتر مذاہب ایک موعود کے منتظر تھے۔ مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ میں اس کا لقب مسیح ہے۔ ہندو اسے کرشن اور بدھ بدھا کے لقب سے موسوم کرتے ہیں، بعینہٖ دیگر مذاہب ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب ایک ہی وجود کے نام ہیں جس کے متعلق امام باقرؒ نے فرمایا کہ مہدی اپنی آمد تمام انبیاء کی آمد قرار دے گا۔ چنانچہ اسی غرض سے اس موعود کیلئے جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔

بعد کی آیات میں مامور من اللہ کے انکار کے نتائج بیان فرمائے گئے ہیں۔ فرمایا، اس دور میں منکرین کو تین شعبوں والے سائے کا سامنا ہوگا۔ ہمارے نزدیک اس سے مراد افواج کے تین شعبے یعنی بری، بحری اور فضائی ہیں۔ جو خشکی سے بھی جنگ مسلط کریں گے اور سمندر سے بھی۔ آسمان سے بھی آگ برسے گی اور کوئی صورت فرار کی نظر نہ آئے گی۔ اگلی آیات اسی تشریح کی تائید میں ہیں، فرمایا یہ قلعہ جیسے بڑے اور بلند شعلے پھینکیں گی جو جوگیا رنگ کے اونٹوں کی مانند ہوں گے۔

آج ہم سب خدا کے فضل سے ان پیش خبریوں کے پورا ہونے پر قرآن مجید کی صداقت کے گواہ ہیں۔

متفرق اعتراضات

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی قبولیت عامہ کے اسباب میں مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی حالت کا جو نقشہ ناقد صاحب نے کھینچا ہے گو اس میں کلام ہو سکتا ہے لیکن چونکہ وہ انجیل پڑھتے ہیں اس لئے میں انھیں مشورہ دوں گا کہ انجیل سے اور کتب تاریخ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور کے یہود کی دینی اور دنیاوی حالت پر نظر ڈالیں، امید ہے بہتر نتیجے تک پہنچیں گے۔

اعتراض: *حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ پیش گوئی پوری نہیں کی کہ مہدی زمین کو عدل سے بھر دے گا جیسے وہ پہلے ظلم سے بھری تھی۔*

جواب انہی الفاظ میں ہے۔ جیسے ظلم سے بھری تھے ویسے ہی عدل سے بھرے گی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ظلم سے بھرنے میں تو ایک عرصہ لگے اور عدل سے فوراً بھر جائے! یہ کام بھی انشاءاللہ جماعت احمدیہ کے ذریعے ہی پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔

ان کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دعویٰ کے بعد مسلمانوں کے ہر طبقے نے مخالفت کی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لعنت بھی فقیہیوں اور فریسیوں کی طرح علماء کہلانے والے طبقے کے حصے میں ہی آئی۔ جبکہ یہ عام مسلمان ہی تھے جنھوں نے دعوے کے بعد بھی عبداللہ آتھم سے مباحثہ کیلئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ہی دعوت دی۔ اور یہ عام مسلمان ہی تھے جنھوں نے مولوی محمد حسین بٹالوی کو اپنی چادر پر بھی بیٹھنے نہیں دیا جب انھیں علم ہوا کہ وہ مرزا صاحب کے خلاف گواہی دینے آئے ہیں۔ حالیہ مخالفت تک پہنچانے میں مولویوں کو خاصا زور لگانا پڑا جس پر انھیں فخر بھی ہے۔

معترض نے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے کردار پر ذاتی نوعیت کے اعتراضات بھی کئے ہیں۔ کاش وہ اس درجے تک خود کو نہ لاتے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ انھوں نے حضورؑ کی سیرت و کردار کا مطالعہ کیا ہو اور اس کے بعد یہ چند تحفظات پیدا ہوئے ہوں بلکہ یہود و نصاریٰ کے طریق پر چلتے ہوئے مخالفانہ کتابوں سے انھیں نقل کیا ہے۔ انبیاء پر سخت زبانی کا الزام نیا نہیں، نہ ان کے کردار پر حملے۔ ایسے اعتراضات یہودی بھی کرتے ہیں اور عیسائی بھی۔ انجیل جسے وہ بڑے طمطراق سے پیش کرتے ہیں، کبھی اس میں یہود کے متعلق حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ ہی پڑھ کر دیکھ لیں یا قرآن مجید میں کفار اور ان کے بتوں کے متعلق۔ پھر اگر معاندین دین رشتہ داروں سے تعلق رکھنے پر حضورؑ کا اپنی پہلی بیوی کو بعد از تنبیہ طلاق دینا قابل اعتراض ہے تو معترض کی نظر میں وہ آیت زیادہ قابل اعتراض ہو گی جس میں بیان ہوا ہے کہ اگر امہات المؤمنین محض دنیاوی مال کی خواہش رکھیں تو نبی ﷺ سے علیحدہ ہو جائیں۔ پھر اسی سبب سے عاق کئے جانے پر سب سے زیادہ اعتراض تو اسی بیٹے کو ہونا چاہیے تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ *پھر یہ اعتراض بھی بے بنیاد ہے کہ اتمام حجت کے بغیر مباہلے کیلئے بلایا گیا۔* کیونکہ حضورؑ نے درجن سے زائد کتب لکھنے اور اشتہارات دینے کے بعد مباہلے کیلئے بلایا تھا۔

اس کے علاوہ کچھ اور اعتراض بھی ہیں جو بالکل بے علمی کا نتیجہ ہیں، انھیں میں چھوڑتا ہوں۔

باب پنجم: آیت خاتم النبیین

قرآن مجید واضح طور پر حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کی اتباع میں نبیوں کا آنا جائز رکھتا ہے۔ نیز، ایک موعود کی پیش گوئی بھی فرماتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات اسے قطعیت سے ثابت کر دیتی ہیں:

(۱) ﴿الأعراف:۳۵﴾- باب دوم

(۲) ﴿النساء:﴾- باب دوم

(۳) ﴿آل عمران:۸۱﴾- باب دوم

(٤) ﴿الحج:﴾- باب دوم

(٥) ﴿الجمعة:۳﴾- باب چہارم

(٦) ﴿هود:۱۷﴾- باب چہارم

(۷) التکویر و المرسلات- باب چہارم

ان ابواب میں ہمارے موقف پر عرفان شہزاد صاحب کی تنقید کا تفصیلی جواب خود ان کی تفاسیر سے دیا گیا ہے۔ یعنی اصلاحی و غامدی صاحب کے اپنے الفاظ ہمارے موقف کی تائید میں ہیں۔ اس موضوع پر قرآن مجید کا موقف واضح ہو جانے کے بعد اب ہم آیت خاتم النبیین کی درست تفسیر قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔ نیز، غامدی صاحب کی تفسیر کی غلطی بھی واضح کئے دیتے ہیں۔ سورۃ احزاب آیت 40 میں ارشاد فرمایا:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕوَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾

محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ (تدبر قرآن)

اس آیت مبارکہ کی تفہیم میں جس لفظ کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ لٰکِنْ ہے جس کا ترجمہ "بلکہ" کیا گیا ہے۔ یہی حرف تمام نزاع کا فیصلہ کر دیتا ہے اور کسی غیر متعلقہ معنی کیلئے راہ نہیں چھوڑتا۔ لٰکِنْ حرفِ استدراک کہلاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اس سے دو متضاد باتیں اس طرح متصل کی جاتی ہیں

کہ پہلی بات سے پیدا ہونے والا شبہ، دوسری بات سے رفع کیا جاتا ہے۔ عام فہم زبان میں اس بات کو مندرجہ ذیل مثالوں سے سمجھیں جو اس آیت مبارکہ کی ترکیب کے عین مطابق ہیں:

وہ تمھارے بچوں میں سے کسی کے استاد نہیں بلکہ فلاں کے استاد ہیں۔

وہ تمھارے قبائل میں سے کسی کے سردار نہیں بلکہ فلاں کے سردار ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس ترکیب پر کسی بھی زبان میں کوئی بھی جملہ مندرجہ بالا مفہوم کے خلاف لایا نہیں جا سکتا۔ حرف استدراک سے پہلے استاد/سردار ہونے کی نفی کی گئی ہے اور جملہ تب تک بامعنی نہیں ہو سکتا جب تک اسی نفی کو اثبات میں نہ بدلا جائے یعنی استاد/سردار ہونا بیان نہ کیا جائے۔ نیز، پہلے جملے سے یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ شاید کسی کے بھی استاد/سردار نہیں جس کا ازالہ دوسرے جملے سے کیا گیا ہے۔ یہ زبان کا عام قاعدہ ہے۔

اب آیت خاتم النبیین کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ حالات ملاحظہ فرمائیں جس میں یہ آیت نازل ہوئی:

جب آنحضرتؐ کے منہ بولے بیٹے حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی تو آنحضرتؐ نے ان سے شادی کر لی۔ اس سے مخالفین نے طوفان کھڑا کر دیا کہ آپؐ نے اپنی بہو سے شادی کر لی ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالی نے فرمایا کہ محمد ﷺ کی بہو کہاں سے ہونے لگی؟ جبکہ وہ تو تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ ہی نہیں ہیں۔ سو تم کس بنا پر اعتراض کر رہے ہو؟

اب دیکھتے ہیں کہ اس آیت پر حرف استدراک کا اطلاق کس طرح ہوتا ہے۔ فرمایا: "محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔"

اول، ہمیشہ دو متضاد باتیں لٰکِنْ سے جوڑی جاتی ہیں۔ اس لئے اگر پہلے جملے میں آنحضرتؐ کے باپ ہونے کی نفی کی گئی ہے تو دوسرے جملے میں لازماً آپؐ کے باپ ہونے کی تصدیق ہونی چاہئے۔ لیکن یہاں تو دوسرے جملے میں فرمایا کہ آنحضرتؐ رسول اللہ اور خاتم النبیین ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "باپ نہ ہونا" اور "رسول ہونا" ایک دوسرے سے متضاد کیسے ہیں؟ چنانچہ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں "رسول اللہ" کے الفاظ سے امتیوں کا باپ اور "خاتم النبیین" سے نبیوں کا باپ ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یعنی آیت کا مدعا یہ ہے کہ آنحضرتؐ کسی مرد کے جسمانی باپ نہیں بلکہ روحانی باپ ہیں امتیوں کے بھی اور نبیوں کے بھی۔ اس لئے "خاتم النبیین" کی جو بھی تفسیر کی جائے، اسے اِس اصولی مفہوم کی تائید میں ہونا چاہئے نہ کہ اس کے برخلاف۔ بہت سے مفسرین نے حرف استدراک کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی تفسیر بیان کی ہے اور مولانا قاسم نانوتوی نے اپنی کتاب "تحذیر الناس" میں اس پر تفصیلاً بحث کی ہے۔

دوم، پہلے جملے سے کیا شبہ پیدا ہوتا تھا جو رفع کیا گیا ہے؟ کیونکہ حرف استدراک کا بنیادی مقصد تو یہی ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں یعنی آپؐ کی کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے۔ دراصل عرب کلچر میں نرینہ اولاد کا نہ ہونا کمتر بلکہ ابتر ہونا سمجھا جاتا تھا، اور قرآن مجید گواہ ہے کہ آپؐ کو ابتر ہونے کا طعنہ بھی دیا جاتا تھا۔ (ابتر: وہ شخص جس کی نسل منقطع ہو جائے اور کوئی اس کا نام لیوا نہ رہے۔) اس کے جواب میں آنحضرتؐ کی عظمت بیان فرمائی ہے کہ اگر آپؐ کسی مرد کے باپ نہیں تو اس میں ابتر ہونے کی کیا بات ہے؟ کیونکہ:

(۱) آپؐ اللہ کے رسول ہیں جس سے ایک طرف آپؐ کے نام لیوا روحانی اولاد کے طور پر ہمیشہ موجود رہیں گے جبکہ دوسری طرف سورۃ کوثر کی پیش گوئی کے مطابق آپؐ کے دشمنوں ابو جہل، عاص اور ولید کی نسل ختم کی جائے گی جو خود کو آنحضرتؐ سے منسوب کر کے آپؐ کی ہی اولاد میں شامل ہو جائے گی۔

(۲) آپؐ خاتم النبیین یعنی نبیوں کی مہر بھی ہیں۔ یعنی اب قیامت تک صرف وہی شخص نبی ہو پائے گا جس پر اس مہرؐ (آنحضرتؐ) کی چھاپ ہو۔ اور یہ کامل اطاعت ہی ہے جو آنحضرتؐ کی چھاپ کسی شخص میں پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا نہ صرف آپؐ کی روحانی اولاد جاری رہے گی بلکہ آئندہ نبی بھی صرف انہی میں سے آئیں گے اور آپؐ ان کیلئے باپ کی طرح ہیں۔ اس لئے ابتر ہونا تو بہت دور کی بات ہے، آنحضرتؐ کو تو وہ درجہ عطا ہوا ہے جو کبھی کسی نبی کے حصے میں نہیں آیا۔ اسی بات کو سورۃ نساء میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ اور اس رسولؐ کی اطاعت کرے گا وہ نبیوں میں شامل ہو جائے گا (دیکھیں باب دوم)۔

پس اگر خاتم النبیین کے یہ معنی کیے جائیں کہ آنحضرتؐ کے بعد کوئی بھی نبی نہیں آسکتا۔ تو یہ آیت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے، سیاق و سباق سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا اور حرف استدراک بے جا قرار پاتا ہے۔ نیز، ابتر ہونے کا اعتراض جس کا سورۃ کوثر میں ذکر کیا گیا ہے، پختہ ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ان آیات میں آنحضرتؐ کی فضیلت کا بیان ہے جس کی مزید تائید صحیح مسلم کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرتؐ نے دوسرے انبیاء پر اپنی ایک فضیلت خاتم النبیین ہونا بیان فرمایا ہے۔ سو، خاتم النبیین کا لقب فضیلت کا لقب ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ آخر پر آنے اور کسی نعمت خداوندی کو ختم کر دینے میں کوئی فضیلت نہیں ہوتی۔ نیز، عربوں میں خاتم کا لفظ فضیلت کے معنوں میں ہی مقبول ہے۔ چنانچہ کلام عرب میں خاتم الشعراء، خاتم الاولیاء، خاتم الاطباء وغیرہ کا محاورہ عام پایا جاتا ہے۔ نہ یہ لفظ "آخری" کے معنوں میں کبھی مقبول ہوا اور نہ آج تک کوئی عربی دان اسے آخری کے متبادل لفظ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

غامدی صاحب کی تفسیر

مودودی اور غامدی صاحب اس آیت کی تفسیر میں کفار کی جانب سے اٹھائے گئے دو اعتراضات کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) ان کا اعتراض تھا کہ آنحضرتؐ نے اپنی بہو سے شادی کر لی ہے۔

(۲) ان کا دوسرا اعتراض تھا کہ متبنی کی مطلقہ سے متعلق شریعت بیان کر دی لیکن کیا ضروری تھا کہ آنحضرتؐ اس پر عمل کرتے ہوئے حضرت زینب سے شادی بھی کر لیں؟ یعنی یہ مثال قائم کرنا ضروری کیوں تھا؟

چنانچہ غامدی صاحب کے نزدیک لٰکِنْ سے اسی دوسرے شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے کہ چونکہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، اس لئے یہ ذمہ داری آپؐ نے ہی ادا کرنی تھی۔ اور رسولوں سے ایسے کام پہلے بھی لئے گئے ہیں۔ اور پھر آپؐ خاتم النبیین یعنی آخری نبی بھی ہیں، اس لئے یہ مثال قائم کرنا آئندہ کیلئے موخر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اول، اس بات کو سمجھ لیجئے کہ اگرچہ قرآن مجید اس شادی کا مقصد مومنین کیلئے مثال قائم کرنا بیان کرتا ہے لیکن اس دوسرے اعتراض کی طرف اشارہ تک نہیں کرتا۔ بلکہ قرآن مجید اور تاریخ دونوں سے ثابت ہے کہ معترضین کی جانب سے واحد اعتراض یہ اٹھایا گیا تھا کہ آنحضرتؐ نے اپنی بہو سے شادی کر لی ہے۔ ان کی جانب سے ایسا کوئی اعتراض کیا ہی نہیں گیا تھا کہ مثال قائم کرنا کیوں ضروری تھا؟ اس بات کا اعتراف ناقد صاحب کو بھی ہے۔ سو یہ دوسرا اعتراض ایک فرضی اعتراض ہے جو بلا ثبوت ہے اور اپنی تفسیر درست ثابت کرنے کیلئے ان صاحبان کی طرف سے بیان کیا گیا ہے۔

دوم، لٰکِنْ سے صرف اُس شبہ کا ازالہ کیا جاتا جو اس سے پہلے لکھے جملے سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ آپ کوئی بھی شبہ فرض کریں اور اسے اس کے اطلاقات میں داخل کر دیں۔ لہٰذا ان حضرات کی طرف سے دوہری غلطی کی گئی ہے کہ ایک تو فرضی اعتراض بنایا اور پھر اسے بے محل جڑنے کی کوشش کی۔

سوم، اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ یہ دوسرا اعتراض بھی کیا گیا تھا تب بھی یہ کیا جواب ہوا کہ چونکہ آپؐ اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں، اس لئے آپؐ کیلئے یہ شادی کرنا ضروری تھی؟ اس جواب کے منطقی مغالطے کو نظر انداز کر دیں تب بھی ہر شخص جانتا ہے کہ دعوی دلیل نہیں ہوا کرتا۔ معترضین کیلئے آنحضرتؐ کی نبوت و رسالت ایک دعوی تھا، ان کیلئے اسے دلیل بنا کر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی جو بات ثابت کرنی ہے، اُسی کو ثبوت کے طور پر بیان کیا جا رہا ہے۔ اور پھر یہ کہنا کہ پہلے رسول بھی تو ایسا کرتے رہے ہیں، اس بات کی دلیل نہیں کہ جو بھی ایسا کرے، لازماً رسول ہو جائے گا۔ ایسی تفاسیر نہ صرف منطق اور لسانی قواعد کے خلاف ہیں بلکہ ان سے آنحضرتؐ کی ہتک بھی ہے۔

اب آتے ہیں لفظ "خاتم" کی طرف، اس کے معنی پر بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ غامدی صاحب بھی اس کا مطلب "مہر" ہی کرتے ہیں۔ لیکن اس حوالے سے ان کے کچھ مغالطوں کا جواب ضروری ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مہر کے دو ہی کام ہوتے ہیں، ایک تصدیق کرنا اور دوسرا کسی چیز کو بند کرنا۔ اگر اس آیت میں مہر بند کرنا مراد لیا جائے تب تو بات بالکل واضح ہے کہ نبوت ختم ہو گئی۔ اور اگر مہر کو تصدیق کے معنوں میں لیا جائے تو کوئی بھی شخص اپنی نبوت کے محضر پر آنحضرت ؐ کی مہر کہاں سے دکھا سکتا ہے؟

اس پر عرض ہے کہ کیا "خاتم النبیین" سے یہ مراد ہے کہ آنحضرت ؐ کے پاس لوہے لکڑی کی کوئی مہر ہے؟ ہر گز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو خود آپ ؐ کو ہی مہر قرار دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کو مہر کہا جائے گا تو اس کی چھاپ کسی کاغذ پر تو نہیں ہو سکتی۔ اور پھر نبوت کا محضر (کاغذ) کون سا ہوتا ہے؟ انبیاء کے پاس اپنی صداقت کیلئے کوئی مہر لگا کاغذ نہیں ہوا کرتا بلکہ تمام دلائل و براہین ان کی ذات سے ہی صادر ہوتے ہیں۔ اس لئے تصدیقی معنوں سے مراد یہ نہیں کہ کسی "کاغذ" پر "آنحضرت ؐ کی مہر" کی چھاپ ہو بلکہ یہ مراد ہے کہ خود "آنحضرت ؐ" کی چھاپ کسی "شخص" پر ہو۔ اور یہ کامل اطاعت ہی ہے جو آنحضرت ؐ کی چھاپ کسی شخص میں پیدا کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نبوت آپ ؐ کی اتباع کرنے والوں میں ہی رکھ دی گئی ہے۔

جہاں تک مہر بند کرنے کے معنوں کا سوال ہے، ہم واضح کر چکے ہیں کہ سیاق وسباق اسے قبول نہیں کرتا۔

باب ششم: حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خداداد فصاحتِ کلام

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی فصاحتِ کلام پر اعتراض کرتے ہوئے عرفان صاحب نے لکھا ہے کہ ماہر لسانیات مرزا صاحب کے عربی کلام کی فصاحت کے قائل نہیں بلکہ اس میں گرامر کی اغلاط بھی پائی جاتی ہیں۔

قبل اس کے کہ جواب دیا جائے، حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے لٹریچر کے حوالے سے ان کے معاصر عالم وادیب ابوالکلام آزاد صاحب کی رائے ملاحظہ ہو:

"۔۔۔مرزا صاحب کے لٹریچر کی قدر وعظمت آج جب کہ وہ اپنا کام پورا کر چکا ہے ہمیں دل سے تسلیم کرنی پڑتی ہے۔اس مدافعت نے نہ صرف عیسائیت کے اس ابتدائی اثر کے پرخچے اڑا دیئے جو سلطنت کے سایہ میں ہونے کی وجہ سے حقیقت میں اس کی جان تھا بلکہ خود عیسائیت کا طلسم دھواں ہو کر اڑنے لگا۔۔۔اس کے علاوہ آریہ سماج کی زہریلی کچلیاں توڑنے میں بھی مرزا صاحب نے اسلام کی خاص خدمت سرانجام دی ہے۔۔۔آئندہ ہماری مدافعت کا سلسلہ خواہ کسی درجہ تک وسیع ہو جائے ناممکن ہے کہ مرزا صاحب کی یہ تحریریں نظر انداز کی جا سکیں۔" (وکیل امرتسر جون 1908)

بعد ازاں، عرض ہے کہ یہ بعینہ وہی اعتراض ہے جو قرآن مجید پر بھی کیا جاتا ہے۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب لوگ کسی گزشتہ کلام کی بعض تراکیب و اسالیب کو اپنی حالیہ مروجہ زبان سے مختلف پاتے ہیں تو بوجہ کم علمی یا تعصب یا دونوں کے انھیں "اغلاط" شمار کرتے ہیں جیسا کہ متعصب عرب مسیحیوں نے قرآن مجید کے حوالے سے اور معاندین احمدیت نے کلام مسیح موعود علیہ السلام کے حوالے سے یہ رویہ اختیار کیا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بطور نشان عربی زبان میں کمال عطا فرمایا ہے۔آپ علیہ السلام فرماتے ہیں: "ومن آيتي أنه تعالى وهب لي ملكة خارقة للعادة في اللسان العربية" (نجم الہدی، روحانی خزائن جلد 14 صفحہ 107) میرے نشانات میں سے ایک نشان یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے لسان عربی میں خارق عادت ملکہ عطا فرمایا ہے۔

اس کے ثبوت کے طور پر آپ علیہ السلام نے 22 عربی کتب تحریر فرمائیں جن کے کل صفحات 2200 سے زائد ہیں اور ان میں موجود عربی قصائد کے اشعار 3500 سے زائد ہیں۔انہی میں سے ایک کتاب خطبہ الہامیہ ہے جو نہایت فصیح و بلیغ عربی، روحانی نکات اور معارف سے پُر خطبہ ہے جو آپ علیہ السلام نے فی البدیہہ ارشاد فرمایا تھا۔

مخالفین نے بھی اس فصاحت کلام کو قبول کیا ہے لیکن کفار مکہ کا طریق اختیار کرتے ہوئے کبھی کہا کہ پہلوں سے نقل کر لیا ہے اور کبھی کہا کہ کسی عرب سے لکھوا لیا ہے۔

نیز آپ علیہ السلام فرماتے ہیں: "ایک نادان نکتہ چینی کرتا ہے کہ فلاں صلہ درست نہیں یا ترکیب غلط ہے، اور اسی قسم کا صلہ اور اسی قسم کی ترکیب اور اسی قسم کا صیغہ قدیم جاہلیت کے کسی شعر میں نکل آتا ہے۔" (نزول المسیح، روحانی خزائن جلد 18 صفحہ 436)

ایک اور مقام پر فرمایا: "کچھ تھوڑا عرصہ گزرا ہے کہ ایک مخالف مولوی نے اسی طرح میری تالیف میں غلطیاں نکالیں۔ دوسرے اہل علم اور مخلص نے وہی غلطیاں قرآن سے نکال کر ان کی صحت کر دی ہے۔ ایک مخالف نے ایک شعر کے وزن میں بحث کی۔ اسی وقت ایک ادیب عربی نے قدماء میں سے ایک مسلم اور مشہور شاعر کا شعر پیش کیا۔" (مکتوب بنام مولوی اصغر علی صاحب)

چنانچہ ایک فلسطینی احمدی ڈاکٹر ایمن عودہ صاحب نے ان تمام مزعومہ اغلاط کو ایک کتاب میں جمع کر کے ان کے مقابل قرآن مجید، کلام عرب، لغات اور قدیم وجدید علماء صرف ونحو سے بعینہ ویسی ہی تراکیب نقل کر دی ہیں جس سے نہ صرف ہمیشہ کیلئے اس امر کا تصفیہ ہو گیا ہے بلکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے خداداد فصاحت کے دعوے کی اس رنگ میں بھی تصدیق ہو گئی ہے۔ یہ کتاب "الإيجاز في مظاهر الإعجاز" کے نام سے مندرجہ ذیل لنک سے ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے:

https://www.islamahmadiyya.net/booksinner.asp?recordId=34406

اسی موضوع پر اردو کتاب "عربی زبان میں خداداد فصاحت وبلاغت کا عظیم الشان نشان" اس لنک سے ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے:

https://www.alislam.org/urdu/book/%D8%B9%D8%B1%D8%A8%DB%8C-%D8%B2%D8%A8%D8%A7%D9%86-%D9%85%DB%8C%DA%BA-%D8%AE%D8%AF%D8%A7%D8%AF%D8%A7%D8%AF-%D9%81%D8%B5%D8%A7%D8%AD%D8%AA-%D9%88-%D8%A8%D9%84%D8%A7%D8%BA%D8%AA/

اس کی مثال کے طور پر، ناقد صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے عربی الہام " یا مریم اسکن أنت وزوجک الجنۃ" کا حوالہ دے کر اعتراض کیا ہے کہ مریم کے ساتھ مونث کا صیغہ آنا چاہئے تھا۔

یہاں بھی صاف ظاہر ہے کہ معترض صاحب نے اصل کتاب سے اس الہام کا سیاق وسباق نہیں دیکھا بلکہ کسی اینٹی احمدیہ لٹریچر سے نقل کیا ہے۔ اگر وہ اس کا سیاق دیکھتے تو معلوم ہو جاتا کہ یہاں مریم کا لفظ مذکر کیلئے بطور استعارہ استعمال ہوا ہے جیسے سورۃ تحریم میں اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ درجے کے مومنوں کی مثال حضرت مریم سے دی ہے۔ پس اگر مریم سے کوئی مؤنث مراد ہوتی تب مؤنث صیغہ آتا۔ یہ قاعدہ صرفیوں اور نحویوں میں مسلم ہے۔

عرفان صاحب نے دوسرا دعویٰ یہ پیش کیا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اردو نثر بھی غیر فصیح ہے اور اس میں بھی اغلاط پائی جاتی ہیں۔ نیز یہ بھی کہا ہے کہ مرزا صاحب نے خود بھی بسیار نویسی کی وجہ سے بعض اغلاط کا پایا جانا قبول کیا ہے۔ جس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ الہام میں غلطیاں کیونکر ہو سکتی ہیں؟

پہلے میرزا حیرت مدیر اخبار کرزن گزٹ دہلی کی اپنے یکم جون 1908 کے پرچے میں لکھی یہ تحریر ملاحظہ ہو:

"اگرچہ مرحوم پنجابی تھا۔ مگر اس کے قلم میں اس قدر قوت تھی کہ آج سارے پنجاب بلکہ بلندی ہند میں بھی اس قوت کا کوئی لکھنے والا نہیں۔۔۔ اس کا پرزور لٹریچر اپنی شان میں نرالا ہے اور واقعی اس کی بعض عبارتیں پڑھنے سے ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔۔۔ اس نے ہلاکت کی پیشگوئیوں، مخالفتوں اور نکتہ چینیوں کی آگ میں سے ہو کر اپنا رستہ صاف کیا اور ترقی کے انتہائی عروج تک پہنچ گیا۔"

اب جواب کی طرف آتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ میری تحریرات میں کوئی غلطیاں نہیں سوائے سہو کاتب اور لغزش قلم کے جو اتفاقی ہیں، جہالت سے نہیں۔ اور اس کے پرکھنے کا یہ مسلمہ اصول بیان فرمایا ہے کہ وہی الفاظ وتراکیب آپ علیہ السلام کی کتب میں دیگر بہت سے مقامات پر صحیح درج ہوں گی۔ اور یہ امر عام تحریرات کے متعلق بیان فرمایا گیا ہے، الہامات کے متعلق نہیں۔ (مکتوب احمد، روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 241 تا 242) (سرّ الخلافہ، روحانی خزائن جلد 8 صفحہ 316)

علاوہ ازیں، فاضل ناقد کا یہ اعتراض بھی پہلے اعتراض کی مانند ہی ہے۔ اس کی تفصیل کیلئے انھوں نے ڈاکٹر غلام جیلانی برق صاحب کی کتاب حرف محرمانہ کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن شاید انھیں معلوم نہیں کہ اس کتاب کا جواب قاضی نذیر صاحب فاضل اپنی کتاب تحقیق عارفانہ کی صورت میں پہلے ہی دے چکے ہیں۔ جس میں انھوں نے برق صاحب کی پیش کردہ مزعومہ اغلاط اور غیر فصیح عبارات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان میں سے کچھ معترضہ الفاظ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریر میں موجود ہی نہیں، بعض غلط املاء کے ساتھ نقل کر دیے ہیں مثلاً لفظ دودھ کو فارسی لفظ دود سمجھ کر اعتراض کیا ہے، بعض عبارات کو ثقیل قرار دیا تو قاضی صاحب نے ویسی ہی عبارات ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری اور حالی وغیرہ کی تحریرات سے دکھادی ہیں، اردو اشعار پر

اعتراض کئے تو قاضی صاحب نے ویسی ہی تراکیب غالب، مومن، درد اور اقبال وغیرہ کی شاعری میں دکھادیں۔ یہ کتاب مندرجہ ذیل لنک سے ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے:

https://www.alislam.org/urdu/book/%d8%aa%d8%ad%d9%82%db%8c%d9%82%d9%90-%d8%b9%d8%a7%d8%b1%d9%81%d8%a7%d9%86%db%81/

اب آخر میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا اسلوب کلام اور اس میں الٰہی آواز کی گونج ملاحظہ ہو:

"ہمارا بہشت ہمارا خدا ہے، ہماری اعلیٰ لذات ہمارے خدا میں ہیں کیونکہ ہم نے اس کو دیکھا اور ہر ایک خوبصورتی اس میں پائی۔ یہ دولت لینے کے لائق ہے اگرچہ جان دینے سے ملے۔ اور یہ لعل خریدنے کے لائق ہے اگرچہ تمام وجود کھونے سے حاصل ہو۔ اے محرومو! اس چشمہ کی طرف دوڑو کہ وہ تمہیں سیراب کرے گا۔ یہ زندگی کا چشمہ ہے جو تمہیں بچائے گا۔ میں کیا کروں اور کس طرح اس خوشخبری کو دلوں میں بٹھادوں۔ کس دف سے میں بازاروں میں مُنادی کروں کہ تمہارا یہ خدا ہے تا لوگ سن لیں۔ اور کس دوا سے میں علاج کروں تا سننے کے لئے لوگوں کے کان کھلیں"۔ (کشتی نوح، روحانی خزائن جلد 19 صفحہ 22-21)

"دنیا مجھے قبول نہیں کر سکتی کیونکہ میں دنیا میں سے نہیں ہوں مگر جن کی فطرت کو اُس عالم کا حصہ دیا گیا ہے وہ مجھے قبول کرتے ہیں اور کریں گے۔ جو مجھے چھوڑتا ہے وہ اُس کو چھوڑتا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے اور جو مجھ سے پیوند کرتا ہے وہ اُس سے کرتا ہے جس کی طرف سے میں آیا ہوں۔ میرے ہاتھ میں ایک چراغ ہے۔ جو شخص میرے پاس آتا ہے ضرور وہ اس روشنی سے حصہ لے گا مگر وہ شخص جو وہم اور بدگمانی سے دور بھاگتا ہے وہ ظلمت میں ڈال دیا جائے گا۔ اِس زمانہ کا حصنِ حصین میں ہوں۔ جو مجھ میں داخل ہوتا ہے وہ چوروں اور قزاقوں اور درندوں سے اپنی جان بچائے گا۔" (فتح اسلام، روحانی خزائن جلد 3 مطبوعہ 2009 صفحہ 34)

"اے یورپ تو بھی امن میں نہیں اور اے ایشیا تو بھی محفوظ نہیں۔ اور اے جزائر کے رہنے والو! کوئی مصنوعی خدا تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ میں شہروں کو گرتے دیکھتا ہوں اور آبادیوں کو ویران پاتا ہوں۔ وہ واحد یگانہ ایک مدت تک خاموش رہا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے مکروہ کام کئے گئے اور وہ چپ رہا مگر اب وہ ہیبت کے ساتھ اپنا چہرہ دکھلائے گا جس کے کان سُننے کے ہوں سُنے کہ وہ وقت دور نہیں۔ میں نے کوشش کی کہ خدا کی امان کے نیچے سب کو جمع کروں پر ضرور تھا کہ تقدیر کے نوشتے پورے ہوتے۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اِس ملک کی نوبت بھی قریب آتی جاتی ہے نوح کا زمانہ تمہاری آنکھوں کے

سامنے آجائے گا اور لوط کی زمین کا واقعہ تم بچشم خود دیکھ لو گے۔ مگر خدا غضب میں دھیما ہے توبہ کرو تا تم پر رحم کیا جائے جو خدا کو چھوڑتا ہے وہ ایک کیڑا ہے نہ کہ آدمی اور جو اُس سے نہیں ڈرتا وہ مُردہ ہے نہ کہ زندہ۔" (حقیقۃ الوحی۔ روحانی خزائن جلد 22 صفحہ 269)

اختتامیہ

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کی عالم اسلام اور تمام دنیا کیلئے عظیم الشان خدمات ہیں۔ میں یہاں اختصار کے پیش نظر صرف دو نقل کرتا ہوں:

اول، حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دور نبوی کے اسلام کا خوبصورت چہرہ دنیا کو دکھایا اور نہ صرف اس کی تعلیم کو زندہ کیا بلکہ اس پر عمل پیرا جماعت بھی قائم فرمادی۔ "اپنی ذات کو ہستی باری تعالیٰ کے ایک زندہ گواہ کے طور پر پیش کیا۔ اور اپنے ماننے والوں میں اپنی عظیم قوت قدسیہ کے ذریعہ ایسا پاکیزہ انقلاب پیدا کیا کہ وہ خدا نما وجود بن گئے۔" (احمدیت نے دنیا کو کیا دیا؟ صفحہ 15-16)

یہ دونوں کام ایسے ہیں جو انبیاء سے ہی خاص ہیں اور علماء کہلانے والا طبقہ پوری مذہبی تاریخ میں نہیں کر پایا۔ علامہ نیاز فتح پوری صاحب اس کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں: "اس میں کلام نہیں کہ انہوں نے یقیناً اخلاق اسلامی کو دوبارہ زندہ کیا اور ایک ایسی جماعت پیدا کر کے دکھادی جس کی زندگی کو ہم یقیناً اسوۂ نبی کا پر تو کہہ سکتے ہیں۔" (رسالہ نگار لکھنو نومبر 1959)

دوم، "آپؑ کو عطا ہونے والا علم کلام دراصل وہ آسمانی حربہ ہے جو باطل کے سب قلعوں کو مسمار کرتا چلا جاتا ہے اسکی لاثانی تاثیرات کا یہ عالم ہے کہ آپ کے وصال کے بعد بھی یہ لازوال علم کلام غلبہ اسلام کا ایک کامیاب ذریعہ ثابت ہو رہا ہے۔ معارف کے اس سمندر سے احمدی مبلغین تو فائدہ اٹھاتے ہی ہیں غیر احمدی علماء بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریرات کو اپنے بیانات اور تحریرات میں بکثرت استعمال کرتے ہیں مگر حوالہ دینے کی جرات نہیں رکھتے۔" (احمدیت نے دنیا کو کیا دیا؟ صفحہ 37)

ناقد صاحب نے لکھا ہے کہ جدید الحاد کا چیلنج، انیسویں صدی کے عیسائیت کے چیلنج سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کا مقابلہ علم و عقل سے ہی کیا جا رہا ہے۔ جب اِس کیلئے کسی نبوت کی ضرورت نہیں تو اُس کیلئے بھی نہیں تھی۔

اول، خود آنحضرت ﷺ نے دجال سے مقابلہ کرنے والے مسیح موعود کو نبی اللہ فرمایا ہے۔ اور اس کی آمد کی منشا صرف ردعیسائیت سمجھنا بھی کم علمی ہے۔

دوم، الحاد کے مقابلے کیلئے بھی جماعت احمدیہ کے مساعی سب سے بڑھے ہوئے ہیں، دلائل عقلیہ میں بھی اور نشانات آسمانی میں بھی۔ جبکہ غیروں کی سب کوششیں صرف عقلی دلائل تک ہیں جو تاریخ مذہب کی روشنی میں ایک بڑی غلطی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم عقلی دلائل سے صرف اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ خالقِ کائنات کا وجود ہونا چاہئے۔ اب ظاہر ہے کہ "وجود ہونا چاہئے" کا مطلب "وجود ہے" نہیں ہوتا۔ یعنی علمی و عقلی دلائل وجودِ خدا کی

ضرورت تک پہنچاتے ہیں یقین تک نہیں۔اسے یقین اور عین الیقین تک پہنچانے کے لئے ہی اللہ تعالیٰ نے انبیاء مبعوث فرمائے ورنہ صرف عقلی دلائل پر ہی اکتفا کرلیا جاتا۔اور یہی وجہ ہے کہ انسان کیلئے تازہ بہ تازہ نشانوں کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی، کسی نمائندہ خدا کی صورت میں بھی اور خود اپنی ذات میں بھی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ غیر از جماعت مسلمانوں میں اس حوالے سے دو قسم کے گروہ پائے جاتے ہیں۔ایک وہ جو صرف روحانی تجربات تک محدود رہنا چاہتے ہیں مثلاً صوفی حلقے۔اور دوسرے وہ جو صرف عقلی دلائل پر اکتفا چاہتے ہیں مثلاً غامدی صاحب کا حلقہ۔اس میدان میں بھی الحمدللہ جماعت احمدیہ ہی ہے جو درست نقطہ نظر کی حامل ہے۔